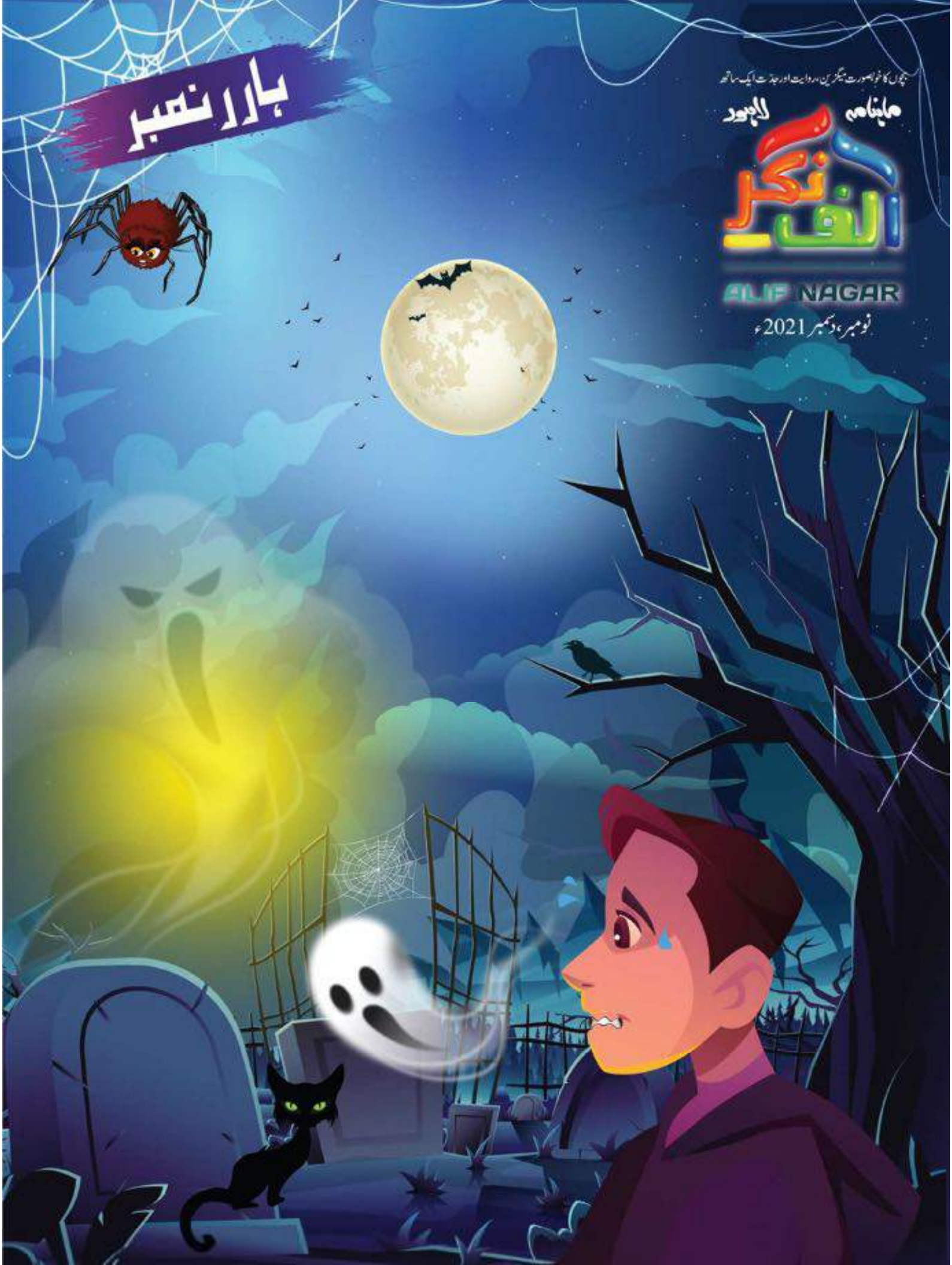

ہارر نمبر
بچوں کا خوبصورت میگزین، روایت اور جدت ایک ساتھ
ماہنامہ
لاہور
الف نگر
ALIF NAGAR
نومبر، دسمبر 2021ء

ALIF KITAB
ماں کا آکاش
آپریشن ضربِ عضب کے پہلے جانباز شہید آفیسر
کیپٹن آکاش آفتاب ربانی
کی دلیرانہ زندگی اور شہادت کی مکمل داستان
ماں کا آکاش
0321 8460220
ابھی آرڈر کریں

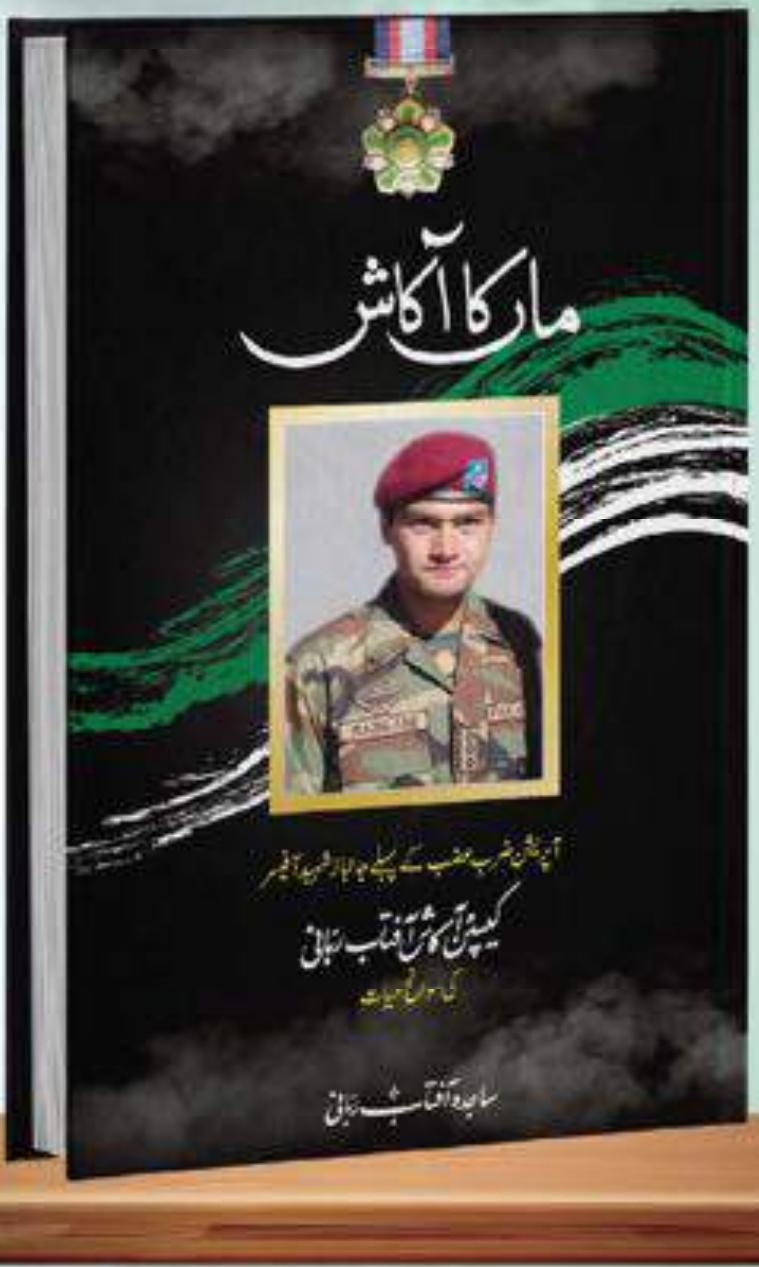

الف نامہ

پیارے دوستو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا، دن رات میں بدلتا ہے اور رات دن میں تبدیل ہوتی ہے۔ موسم بدلتے ہیں۔ خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ نئے پھول کھلتے ہیں جو ہمیں نئی خوشیوں کی اُمید دیتے ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ پچھلے دو سال ہم سب کے لیے بہت مشکل تھے۔ کرونا جیسی وبا نے زندگی کے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ کرونا کی ویکسینیشن کے بعد حالات بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ آہستہ آہستہ معمولاتِ زندگی معمول پر آ رہے ہیں۔ انشاءاللہ! بہت جلد ہم اس وبا پر مکمل قابو پا لیں گے۔ زندگی پھر اُسی خوبصورتی سے رواں دواں ہوگی۔

ساتھیو!

نومبر، دسمبر کے مہینے ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال 9 نومبر کو پیدا ہوئے۔ پاکستان کا خواب سب سے پہلے انہوں نے ہی دیکھا۔ بچوں سے تو اُنہیں بہت اُمیدیں تھیں۔ اسی لیے اُن کو ''شاہین'' کا نام دیتے تھے۔ شاہین جس کی پرواز سب سے بلند ہوتی ہے، اور 25 دسمبر ہمارے پیارے قائداعظم محمد علی جناح کی سالگرہ کا دن ہے قائداعظم کی وجہ سے ہی ہم آزاد وطن میں سانس لے رہے ہیں۔

پیارے بچو!

ہمیں چاہیے کہ ہم علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح جیسی باتیں اپنے اندر پیدا کریں۔ اچھے اچھے کام کریں۔ کسی کے لیے تکلیف اور پریشانی کی وجہ نہ بنیں۔ کسی کا دل نہ دُکھائیں، اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کا بھی بہت خیال رکھیں۔ نومبر، دسمبر کا شمارہ آپ کی پُرزور فرمائش پر ہار نمبر ہے۔ اپنے من پسند شمارے کو پڑھیے اور اپنی قیمتی رائے سے ہمیں آگاہ کریں۔ ہمارے پورے ادارے کی طرف سے سب مسیحی بہن، بھائیوں کو کرسمس کی بہت مبارکباد قبول ہو۔ خوش رہیے خوشیاں بانٹیے۔

والسلام

(ادارہ)

ماہنامہ لاہور

الف نگر

ALIF NAGAR

جلد: 04 نومبر، دسمبر 2021ء شمارہ: 06-07

عمیرہ احمد
چیف کانٹینٹ آفیسر

ایڈیٹر
عائشہ اطہر

سب ایڈیٹر
آمنہ ارشد

معاون
حسن عمر

آرٹ منیجر
ثمین توقیر

گرافک ڈیزائنگ
محمد عباس حسین

کمپوزنگ
ثاقب سلطان

ایڈورٹائزنگ / مارکیٹنگ / سرکولیشن
روحیل آفتاب 0321 846 0220

زیرِ اہتمام: الف کتاب پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

قیمت

فی شمارہ: -/150 روپے | سالانہ (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک): -/1000 روپے

خط کتابت کے لیے: ماہنامہ الف نگر B-1، وائٹ ہاؤس لین 2، سندرداس روڈ، لاہور۔

فون نمبر: 042-36300351 | 0306-6665360

فیس بک: alifnagarofficial یوٹیوب: alifnagarofficial

ای میل: submissions.alifnagar@alifkitab.com

کھل جا سم سم

نومبر، دسمبر 2021ء

صفحہ	عنوان	مصنف
03	نعت	ایوب اختر
04	ہوشیار ہد ہد	سمیعہ علی میمن
05	فلیٹ 99	تحریم جمیل
08	بھٹہ	نضرہ شکیل
10	20 فروری	سیدہ اقراء اعجاز
13	کرسمس کیک	عائشہ اطہر
16	پیپل کا بھوت	ارسلان خان
17	شام سے پہلے	الطاف حسین
20	جن کے تین سنہری بال	سارہ قیوم
23	جادوئی ہاتھ	مہوش اسد شیخ
25	ملت کا پاسباں	ماورا فاروق
26	قبرستان کا بھوت	فائزہ نسیم
27	میں رنگ ہوں	قرۃ العین خرم ہاشمی
30	اُمید کی کرن	رافعہ کاشف
31	خونی خواب	مہرین ابراہیم
33	مہکتے پھول	نذیر انبالوی
35	پُراسرار گڑیا	آمنہ ارشد
40	ڈھونگی بھکاری	فاطمہ عابد
42	چڑیا گھر (نظم)	محمد نذیر مرزا
43	لکڑہارا اور دیو	نظیر فاطمہ
46	چھت کا معمہ	مصباح ناز
48	نیا گھر	فرزین لہرا
51	میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں	سید نیر عامر
52	گڑیا	حسن عمر
54	اُلٹے میاں	
56	پودے (نظم)	بنت مسعود
57	گھوڑوں کا سردار	احمد عدنان طارق
59	کار ویل	رمشا جاوید
61	حسان	محسن ابڑو قادری
67	شیف ثانی	سمیعہ علی

نعت رسول مقبول ﷺ

ایوب اختر

عشق دل میں ہو یا مصطفیٰ آپ کا
ذکر لب پر ہو خیرالوریٰ آپ کا

ذاتِ اقدس ہے ختم الرسل آپ کی
کتنا اونچا ہے یہ مرتبہ آپ کا

راحتِ قلب و جاں یاد ہے آپ کی
ذکرِ اقدس ہے غم کی دوا آپ کا

جھک گئے پیڑ تکریم و تعظیم کو
پتھروں نے بھی کلمہ کہا آپ کا

خوف مجھ کو بھلا کیا نکیرین کا
نام لیوا جو ہوں میں شہا آپ کا

التجا ہے کہ اختر پہ جاری رہے
یوں ہی لطف و کرم یہ سدا آپ کا

مغرور بگلہ اور کالا کوا

سمیعہ علی میمن

جنگل میں موسم بہت خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور سب بگلے بڑے جوش وخروش سے کرکٹ میچ کھیل رہے تھے۔ پاس ہی درخت پر ایک کوا بیٹھا تھا۔ بگلوں کو کھیلتا دیکھ کر اُس کا بھی کرکٹ کھیلنے کو دل للچایا۔ اُس نے بگلوں سے کہا۔

''پیارے بگلوں! مجھے بھی اپنے ساتھ کرکٹ کھیلنے دو۔'' کوے کا یہ کہنا تھا کہ بگلوں میں سے ایک مغرور بگلہ کوے کے قریب آ کر کہنے لگا:

''اپنی شکل دیکھی ہے تم نے کتنے کالے ہو اور ہم اتنے گورے۔ ایسے میں اگر ہم تم جیسے کالے کوے کو اپنے ساتھ کرکٹ کھیلنے دیں گے تو بالکل ایسا ہی لگے گا جیسے دودھ میں مکھی آ گری ہو۔''

اتنے میں ہوشیار ہدہد کا گزر وہاں سے ہوا تو ہوشیار ہدہد نے مغرور بگلے کی بات سن کر اسے ٹوکا۔

''اے چھوٹے بگلے! کسی کے رنگ روپ پر یوں طنز نہیں کرتے کیوں کہ اللہ میاں قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ(۱۳)

''خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

(سورہ الحجرات) ہوشیار ہدہد نے رک کر بگلے اور کوے کو اپنے پروں سے تھوڑا قریب کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے سمجھانے لگا:

''اس آیت میں لفظ پرہیز گاری بڑا توجہ طلب ہے کیوں کہ اللہ کے نزدیک انسان کو جو چیز عزت والا بناتی ہے وہ صرف اور صرف پرہیز گاری ہے۔ تبھی ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے آخری خطبے میں یہی فرمایا تھا کہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں مگر تقوی (یعنی پرہیز گاری) کے ساتھ۔ جو جتنی پرہیز گاری کرے گا وہ اللہ میاں کے یہاں اتنی عزت پائے گا۔ پرہیز گاری کا مطلب ہوتا ہے اللہ میاں کے ناپسندیدہ کاموں کو چھوڑ دینا اور کسی کی صورت پر طنز کرنا بھی اللہ میاں کا ناپسندیدہ کام ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہمیں اپنے رب کے ہاں کتنی عزت چاہیے اور جتنی عزت چاہیے اس کے لیے اتنی پرہیز گاری کرنا ضروری ہے۔ ہوشیار ہدہد کی بات سن کر بگلہ شرمندہ ہوا۔

''سوری ہدہد انکل! آئندہ میں پرہیز گاری اختیار کروں گا اور کوے کی رنگت کا کبھی مذاق نہیں اُڑاؤں گا۔ بگلے کی بات سن کر ہوشیار ہدہد مسکرایا۔''

چلو اب تم اور کوے میاں کرکٹ کھیلو میں چلتا ہوں، اللہ حافظ۔☆

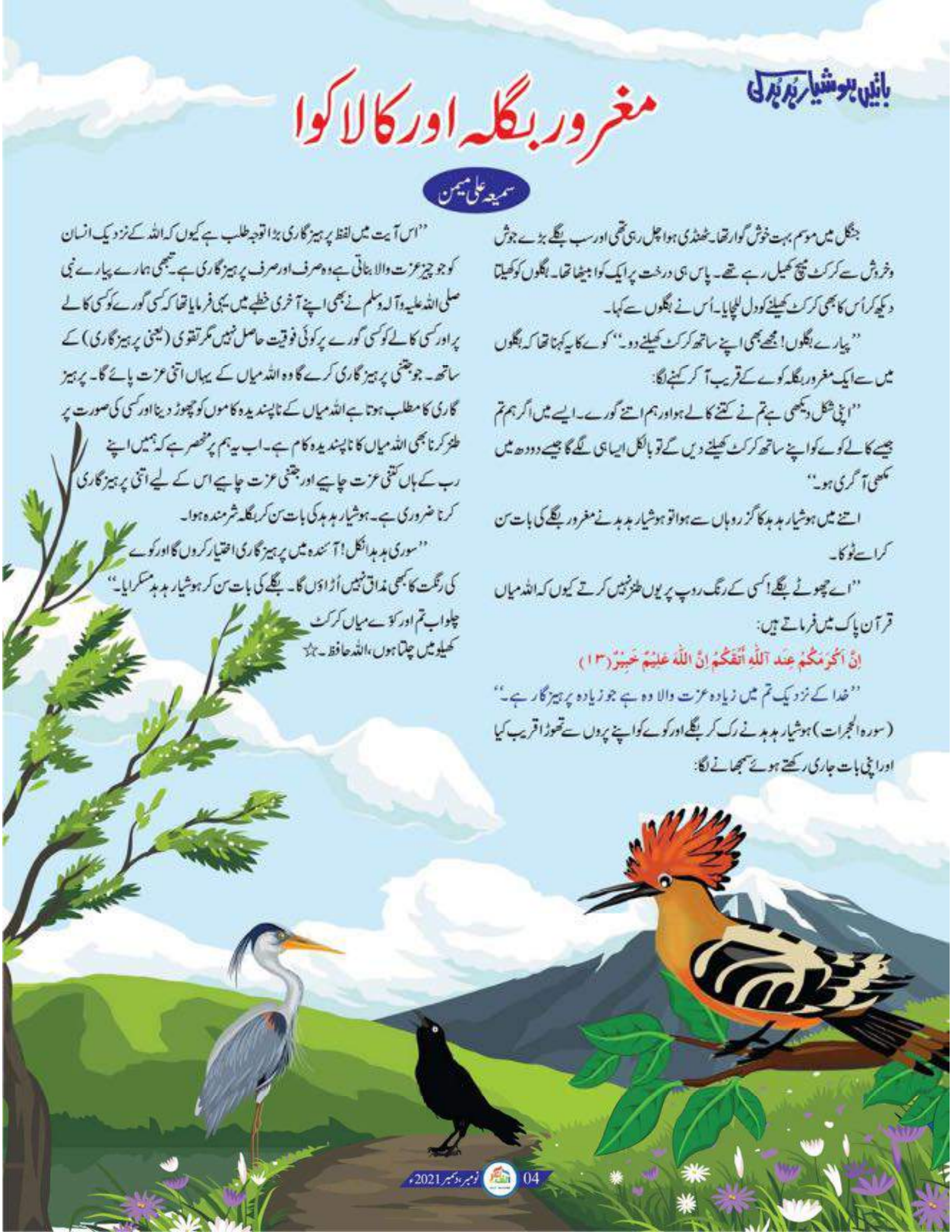

فلیٹ نمبر 99

تحریم جمیل

سامان سے لدا پھندا اسفری بستہ کندھے پر لگائے، مسرت نامی دھان پان سا لڑکا ہانپتے ہوئے فلیٹ کی سیڑھیاں پھلانگتا جا رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک منزل عبور کر کے وہ چوتھی منزل پر پہنچ چکا تھا لیکن فلیٹ کا کوئی پتہ اب تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔

سر کھجاتے ہوئے وہ ناسمجھی میں سامنے کھڑے لڑکے کو پکار بیٹھا۔

''اے لڑکے! یہ فلیٹ نمبر 99 کہاں ملے گا؟''

''پاگل ہو گیا؟ ادھر تو کل ستر فلیٹ ہیں۔ ننانوے فلیٹ تو سرے سے بنا ہی نہیں۔'' اس لڑکے نے بھی اسی طرز میں اسے جواب دیا۔

''ارے! ٹھیکیدار نے یہیں کا پتہ دیا تھا، فلیٹ کہاں غائب ہو گیا؟'' وہ ناسمجھی میں اب بھی ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔

''کہیں تحریر ہے کیا؟ کوئی پتہ لکھ کر دیا ہو کہیں پر؟'' اس لڑکے نے کہا۔

''پتہ وتہ تو نہیں، یہ چابی کے ساتھ فلیٹ نمبر لکھا ہے پرچے پر۔'' مسرت نے بمشکل اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور انگلی کی آڑ سے کھینچ دبوچ کر چابی نکالی۔

لڑکے کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر وہ ندامت سے مسکرا دیا۔ مسکرانے سے اس کے سامنے کے تین دانت نمایاں ہو رہے تھے جن پر پان کی سرخی کے باوجود بدنما داغ دھبے نمایاں ہو رہے تھے۔

کھینچ کر نکالی گئی چابی اس لڑکے کے آگے کی گئی تو معلوم ہوا جسے وہ 99 پڑھ رہا تھا درحقیقت اس کی ناسمجھی اور کم فہمی تھی۔ وہ 66 کو 99 سمجھ بیٹھا تھا۔

''اب سمجھا میں۔'' سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے مسرت پھر مسکرانے لگا۔

''اب یہ دانت دکھانا بند کرو۔ پانچویں منزل پہ تیسرا فلیٹ ہے بائیں جانب۔'' وہ لڑکا جانے کے لیے آگے بڑھا اور پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔

''اب یہاں آ ہی گئے ہو تو محلے دار ہونے کی حیثیت سے ایک بات بتائے دیتا ہوں۔ کوشش کرنا رات دس کے بعد سامنے کھڑکی کا پٹ مت کھولنا۔ بلکہ پردہ برابر ہی رکھنا۔'' اس لڑکے نے رازداری کے عالم میں کہا۔

''کیوں میاں، ایسا کیا ہے اس کھڑکی کے پار؟'' مسرت بھی مسرت تھا۔ پوچھے بغیر کہاں رہنے والا تھا۔

''بس منع کر دیا نا! مانو تو ان سب سے دور ہی رہنا۔'' مسرت کو سمجھا کر وہ لڑکا اپنے فلیٹ کی جانب چل دیا تھا۔

مسرت ازل سے احمق تھا۔ اس لڑکے کی باتیں اس کے اوپر سے گزر گئیں۔

وہ سیڑھیاں پھلانگتا اپنے فلیٹ کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھول کر فلیٹ میں داخل ہونے کو تھا کہ وہیں پڑوس کے فلیٹ میں رہنے والی ایک بوڑھی عورت اس کے نزدیک آئی اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لینے کے بعد بولی:

''یہ فلیٹ کا ہے کو خرید لیا؟؟ ٹھیکیدار نے خبردار تو کر دیا تھا نا؟'' بوڑھی عورت اپنا گول چشمہ اتار کر دوبارہ پہن چکی تھی۔ ''یہ ٹھیکیدار بھی بڑا حریص ہے۔ پیسہ دیکھتے ہی رال ٹپکنے لگتی ہے کمبخت کی۔ پیسہ چاہیے چاہے کسی معصوم کی جان ہی جاتی ہو۔'' بوڑھی عورت افسوس کرنے لگی۔

خیر جان خلاصی کراتا مسرت فلیٹ میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی جیسے دنیا بدل سی گئی تھی۔ روشنیوں کا سمندر اسے خوش آمدید کہنے کو تیار بیٹھا تھا۔ کھلے اور ہوادار کمرے میں صوفہ سیٹ نفاست سے سجایا گیا تھا۔ راہداری عبور کرتے ہی ایک جانب سونے کا کمرہ تھا جبکہ مخالف سمت میں باورچی خانہ بنایا گیا تھا۔ باہر سے خستہ حال نظر آنے والا فلیٹ اندر سے کافی شاندار حالت میں تھا۔ ماحول کے زیر اثر مسرت کی طبیعت میں بشاشت اتر آئی تھی۔ مزاج کی طلب تھی کہ گرما گرم چائے کا ایک کپ مل جائے کہیں سے۔

پیٹ پر ہاتھ پھیرتا مسرت باورچی خانے کی جانب چل دیا۔ چولہا تو نصب تھا لیکن پکوائی کا سامان تو اسے ہی لانا تھا۔

سفری بستہ کمرے میں موجود الماری میں ٹھونس کر اس نے فلیٹ کو تالا لگایا اور اسی علاقے میں موجود ایک ڈھابے میں چائے پینے بیٹھ گیا۔

کڑک چائے اور کیک سے ہاتھ صاف کر کے وہ وہیں بیٹھ گیا۔

جب کافی دیر یوں ہی بیٹھ چکا تو جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ کریانے کی دکان سے گھر کے لیے کچھ راشن خریدا اور واپس فلیٹ کی طرف آ گیا۔

رات کو کھانا اس نے خود ہی پکا لیا۔ لمبے شوربے والی دال اور ابلے چاول سے انصاف کر کے چائے کا ایک کپ پیا تو اسے نیند ستانے لگی۔ آخر پورا دن دوڑ دھوپ کرتے گزارا تھا۔ سونے کے لیے کمرے میں آیا تو اس لڑکے کی بات اچانک ذہن میں آن دھمکی۔ کھڑکی پر نظر پڑی تو پردے ہٹے ہوئے تھے۔ کھڑکی کا پٹ بھی کھلا تھا۔ مسرت اٹھ کر کھڑکی کی جانب گیا اور اپنی ڈھیٹ فطرت سے مجبور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

کھڑکی کا پٹ اس عمارت کے عین مخالف سمت میں کھلتا تھا جہاں اسی کے طرز پر تعمیر کی گئی ایک اور عمارت موجود تھی جو کہ سات منزلہ تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ خستہ اور تباہ حال دکھائی دیتی تھی۔ یہاں وہاں سرسری نگاہیں دوڑاتے مسرت کی نظر اچانک سامنے کی جانب مرکوز ہوئی۔ وہاں ایک عورت تھی سرخ لباس میں ملبوس، ہونٹوں کو سرخی سے ڈھکے ہوئے، سیاہ پراسرار آنکھیں کھولے، چوڑیوں سے لدے ہوئے ہاتھ کھڑکی کے پٹ پر لٹکائے باہر کی جانب ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ حیرت کا شدید جھٹکا مسرت کو لگا۔

اس وقت یہ تنہا عورت کیا کھوج رہی تھی؟ مسرت کا ننھا سا ذہن الگ سا گیا تھا۔ سر پہ ہاتھ پھیرتے وہ اس عورت کو آخری بار نظروں کے احاطے میں لینے کو تھا کہ وہ عورت اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ عورت کا مسکرانا تھا کہ مسرت کا کلیجہ حلق کو آ گیا تھا۔ اتنے سفید اور خوبصورت دانت شاید اس نے زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔

اچانک وہ عورت کھڑکی سے پرے ہٹ گئی۔ اس کے عقب میں کہیں ساز بجنے لگا اور وہ عورت ایک دم غائب ہو گئی۔ جوں ہی سورج غروب ہونے کو آیا ہولے ہولے ہر شے سست پڑتی گئی۔ چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر مسرت کی آنکھ کھل گئی۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ فلیٹ سے باہر عقب میں موجود خالی میدان میں کیسے آ گیا۔

دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ دوزانوں بیٹھ گیا۔

چیختی ہوئی عورت اب بھی مسلسل چلا چلا کر سبزی والے سے بحث کر رہی تھی۔

مسرت اٹھ کر واپس اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ طبیعت پر کافی بوجھ تھا۔ چائے کے دو بڑے پیالے پی کر وہ کچھ بہتری محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی رات کے واقعات ذہن میں گردش کرنے لگے۔ کوئی تو سحر تھا اس عورت میں جواب تک وہ اس کیفیت میں جکڑا ہوا تھا۔ تھکا ہوا تھا سو کچھ ہی دیر میں سو گیا۔ پورا دن بستر میں پڑا رہا۔ شام ہونے کو تھی جب آنکھ کھلی۔ سارا دن بھوکا رہنے کے بعد اسے کچھ کھانے کی ضرورت تھی۔ سو فلیٹ کو تالا لگا کر باہر چل دیا۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد اسے ایک سستا ہوٹل نظر آیا۔ پالک کی سبزی اور روٹی اس نے خوب پیٹ بھر کر کھائی۔ ہوٹل والے کو اس کی ذہنی حالت پر کچھ تشویش ہوئی تو وہ اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

''کہاں کے ہو بھیا؟'' ہوٹل والے نے سوال کیا۔

''جہاں کا بھی ہوں، یہاں کا نہیں ہوں'' اس نے جواب دیا تھا۔

''تو پھر کہاں کے ہو؟'' ہوٹل والا بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم شکاریوں کی دنیا سے نہیں ہوں، اتنا جان لو بس۔'' بل کے پیسے میز پر پھینک کر مسرت گھر کو چل دیا۔ چہرے سے شدید تناؤ کا احساس ہو رہا تھا۔ کافی دور تک چلنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ وہ غلط سمت میں چلتا جا رہا تھا۔ کئی گھنٹے کی مسافت طے کر کے گھر پہنچا تو ایک خیال ذہن میں آیا۔ کیوں نا اس لڑکے سے مل کر اس عورت کے بارے میں پوچھا جائے؟ آخر ماجرا کیا ہے؟

یہ خیال اس کے دل کو بھا گیا لیکن اب رات ہونے کو تھی، لہٰذا یہ خیال صبح پر چھوڑ کر

مسرت باورچی خانے میں چائے بنانے لگا۔ چائے کے گھونٹ لیتا وہ گنگنا رہا تھا۔

قریباً آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ مسرت پر عجیب اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ اس کا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پسینے میں شرابور اس نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ وہ عورت اُسی سرخ لباس میں آج بھی وہیں منتظر کھڑی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی مسرت کے ہاتھوں میں طاری لرزش ساکت ہوگئی۔ وہ عورت پراسرار نظروں سے اُسے گھور رہی تھی۔

صبح صادق کا سورج طلوع ہوا تو آنکھوں میں چبھنے والی تیز روشنی سے مسرت کی آنکھ کھل گئی۔ چٹیل میدان میں گرا پڑا مسرت ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

طبیعت میں عجیب اضمحلال طاری تھا۔ اپنی حالت پہ پریشان ہوتا مسرت کچھ سوچ کر اٹھ بیٹھا۔ گھر جانے کی بجائے اُسی پرانے ڈھابے کو چل دیا۔

چائے کا کپ اٹھا کر وہ ڈھابے کے مالک کے نزدیک جا بیٹھا۔

''ایک بات تو بتا لالا! یہ عقب کے فلیٹوں میں جو اوپر کا فلیٹ ہے، تھوڑا باہر کو نکل رکھا ہے جو، وہاں کون لوگ رہتے ہیں؟'' مسرت نے ناسمجھ بنتے ہوئے دکان والے سے سوال کیا۔

''کہاں؟ یہ پچھلے فلیٹوں میں؟'' دکان والے نے اشارہ کیا۔

''ہاں ہاں، وہی جو میدان کے پار ہے۔'' مسرت نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''برسوں بیت گئے، وہاں کوئی انسان تو کیا کسی پرندے نے بھی پر نہیں مارا آج تک۔'' دکان والے نے ماتھے سے ٹپکتی پسینے کی لکیریں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تو وہ عورت کون ہے؟'' مسرت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ارے! کون عورت؟ کیا تو نے بھی دیکھ لیا اسے؟'' دکان والے نے ماتھے پر بل ڈالتے کہا۔

''کہتے ہیں وہاں کوئی آسیب رہتا ہے۔ کچھ لوگوں نے دیکھا بھی ہے لیکن میاں ہم تو سنی سنائی باتوں پہ یقین نہیں رکھتے۔ یہ جن بھوت کچھ نہیں ہوتا۔'' دکان والے نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ مسرت کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ اسے اچانک یاد آیا جب وہ عورت اُسے دیکھتے ہوئے راگ کی آواز پر غائب ہوتی تھی، اس کے پیروں کی برق رفتار حرکت کیونکر اس کی سمجھ میں نہ آسکی تھی۔ وہ پیرا لئے تھے۔

زرد پڑتا چہرہ لیے مسرت دکان سے سیدھا فلیٹ کی جانب بھاگا۔ اپنا سامان سمیٹ کر اس کا ارادہ گاؤں میں اپنی اماں کے پاس واپسی کا تھا۔

فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے مسرت بے یقینی سے اچانک تیسری منزل پر آ کر رک گیا۔ پھر واپس نیچے کو چلا آیا اور ایک آدمی سے استفسار کرنے لگا۔

''پانچویں منزل پر میرا فلیٹ تھا لیکن یہاں تو کچھ دکھائی نہیں پڑ رہا؟'' مسرت اب خوف سے کپکپا رہا تھا۔

''باؤلا ہوا ہے کیا؟ کون سی پانچویں منزل؟ یہاں تو دوسری منزل پر اکا دکا لوگ موجود ہیں۔ تیسری منزل پر جانا ہی ممنوع ہے۔ تو کس کی بات کر رہا ہے؟'' اس آدمی کو اس کی عقل پر شبہ ہو رہا تھا۔

''ارے! اس لڑکے نے مجھے خود کمرے کا پتہ بتایا تھا کمرہ نمبر 99 نہیں بلکہ 66 پتہ نہیں کچھ ایسا ہی تھا۔'' مسرت کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

''کہاں ملا وہ لڑکا تجھے؟ دوبارہ ملے کیا اس سے؟'' بوڑھے آدمی نے پوچھا۔

''وہاں تیسری منزل پر تھا وہ لڑکا۔ پانچویں منزل کا پتہ بھی اسی نے دیا تھا۔''

مسرت کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

بوڑھے آدمی نے اسکی بات سنی تو قہقہہ لگایا۔

''پاگل واگل ہے کیا؟ کون سی منزل؟ یہاں تو خالی میدان ہے۔''

بوڑھا آدمی پھر سے ہنسنے لگا۔

مسرت نے مڑ کر دیکھا تو اردگرد حد نگاہ تک کوئی کٹیا دکھائی نہ پڑتی تھی فلیٹ تو دور کی بات تھی۔ پریشان حال مسرت نے رخ موڑا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ سب میرے ساتھ؟ شہر ہی منحوس ہے یہ۔ سنو بابا جی! یہاں سے نکلنے میں میری مدد کر سکتے ہو؟'' مسرت نے واپس رخ موڑا تو خوف کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ اس ریتلے صحرا کے بیچ و بیچ وہ تنہا کھڑا تھا۔ وحشت اور خوف اس حد تک طاری ہو گئے کہ حرکت قلب نے بھی اسے تنہا کر دیا۔

☆.....☆.....☆

بقلم: گڑیا

''کیا ہوا بیٹا؟ کوئی برا خواب دیکھ لیا تھا؟''

مریم نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔ امی اُس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہنے لگیں:

''میں اسی لیے تمہیں منع کرتی ہوں کہ مغرب کے وقت مت سویا کرو، شیاطین آ کر خواب میں ڈراتے ہیں۔ اچھا چلو دیکھو، تمہارے ابو تمہارے لئے کیا گفٹ لائے ہیں۔''

مریم پرجوش ہو کر اپنے ابو کے ہاتھ میں موجود ایک گفٹ باکس کو دیکھنے لگی جس پر گفٹ پیپر چڑھا ہوا تھا۔:

''ابو! آپ کا بہت شکریہ۔ آپ دنیا کے سب سے اچھے ابو ہیں!'' یہ کہتے ہوئے وہ خوشی خوشی گفٹ پیپر کھولنے لگی۔ اندر ایک ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبے کو کھول کر دیکھا تو اُس کی سانس یکدم رک سی گئی۔ اندر وہی سرخ بالوں والی گڑیا تھی جس کے بال دو چوٹیوں میں بندھے ہوئے تھے اور جس کی آنکھیں نیلی رنگ کی تھی۔ وہ مریم کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

بھٹہ

فضہ شکیل

ویرانے میں دوڑتی گاڑی دھول اڑاتی جا رہی تھی۔ اس میں بیٹھے تینوں دوست گنگناتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے جبکہ ڈرائیور اپنی ساری توجہ سڑک پر مرکوز کیے گاڑی چلا رہا تھا۔ کچی پکی سڑک پر ہچکولے لیتی گاڑی کی حالت بگڑ رہی تھی اور اس میں سوار تینوں دوستوں کی آوازیں اردگرد کھڑے تناور درختوں کے سرسبز پتوں سے ٹکراتی کہیں معدوم ہو جاتیں۔

یہ مہم انہیں دور سے جتنی آسان لگ رہی تھی دراصل ویسی ہرگز نہیں تھی۔ اس ویرانے میں موجود بہت عرصے سے بند پڑے اینٹوں کے بھٹے کا جائزہ لینا ان کی ضدی طبیعت کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ خوف ناک اور ڈراؤنی جگہوں پر جا کر ویڈیوز بناتے تھے۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ اپنے ساتھ اپنے ڈرپوک ڈرائیور انکل اقبال کو لائے تھے۔

''شاعر کہتے ہیں۔'' تقی جو کھڑکی کی طرف بیٹھا ہوا تھا مڑتے ہوئے شبیر اور عباس کو اپنی طرف متوجہ کر گیا۔

شاید ہمیں عزیز نہیں اپنی زندگی
لوٹ آئے لوگ راہِ خطرناک دیکھ کر

''ارے واہ! لیکن دیکھو، راہِ خطرناک سے ڈرنے والے اے آسمان نہیں ہیں ہم۔'' عباس نے بھی یاد کیے گئے شعر کا مصرعہ خراب کر کے داد سمیٹی۔ ویران سڑک پر ان کا قہقہہ کسی جن کی آواز کی طرح گونجا تھا۔ مگر اقبال انکل مزید سہم گئے۔ اینٹوں کا وہ پرانا بھٹہ قریب آ رہا تھا۔

یہ بھٹہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے بنا تھا لیکن یہاں کے لوگوں کے جانے کے بعد سے بند پڑا تھا۔ وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی اور اونچے اونچے ہیبت ناک درختوں کے سبب یہ جگہ ویرانے میں تبدیل ہو گئی۔ شاید آنے والے دنوں میں آبادی بڑھتے بڑھتے یہاں بھی گھر بن جائیں۔

تینوں ایک معرکہ سر کرنے جا رہے تھے جس کی اجازت ان کے والدین نے بڑی مشکل سے دی تھی۔ وہ جانتے تھے پندرہ سال کے یہ تینوں لڑکے بے خوف اور نڈر تھے۔ ایک مرتبہ جب تینوں کسی گاؤں میں انگریزوں کے زمانے کی حویلی میں ویڈیو بنانے گئے تھے تب انہیں وہاں ایک بزرگ نے ان کی بہادری کو دیکھتے ہوئے اس خوفناک بھٹے کا پتہ بتایا تھا۔ تب سے وہ یہاں رات گزارنے کے خواہش مند تھے۔

''سنو۔ میں نے ابھی ایک پرانا آرٹیکل پڑھا ہے۔ آرٹیکل والے بابا جی کہتے ہیں اس سیاہ بھٹے پر جنوں کا قبضہ ہے۔ یہاں کے جنوں کو یہاں کے مزدوروں سے بہت محبت تھی۔ اس لیے بعد میں کوشش کرنے والے لوگوں کو جن کامیاب نہیں ہونے دیتے تھے۔''

گاڑی رکتے ہی تقی نے بہت غور سے شبیر کی بات سنی تھی۔

''اگر ایسا ہے تو آ پھر قسمت آزما کر دیکھتے ہیں، شاید جنوں کو ہم بھی پسند آ جائیں۔'' تینوں نے گاڑی سے اترتے ہوئے ایک نظر اس سیاہ و سرمئی بھٹے کو دیکھا۔ جس کی خستہ حالی اس کی عمر واضح کر رہی تھی۔ اس کے قریب بنے بدحال سے کمرے کی طرف نظر ڈالی جس پر لوہے کا بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ تینوں نے اپنے کیمرے باہر نکالے اور سیٹ کرنے لگے۔

تقی نے اسٹینڈ کو سیٹ کرتے ہوئے قریب کھڑے عباس کو فریم دیکھنے کے لیے کہا۔ عباس کا جواب نہ پا کر وہ مڑا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ''لیکن ابھی تو یہیں تھا اور زمین پر اس کا سایہ بھی نظر آ رہا تھا، پھر اچانک کہاں گیا؟'' خود سے سوال کرتے ہوئے اسے جسم میں ہلکا سا جھٹکا لگتا محسوس ہوا۔ وہ باقی دونوں کو دیکھنے لگا جو کچھ دور ایک اور کیمرہ لگا رہے تھے۔ ان کا رخ دوسری جانب تھا۔ ان کے قریب جاتے تقی نے انہیں پکارا تو اب کی بار جھٹکا ان دونوں کو لگا تھا۔ سامنے نظر آنے والے تقی کو دیکھتے وہ کچھ دور کھڑی گاڑی کے قریب تھوڑی دیر پہلے دکھائی دینے والے تقی کو پھر سے دیکھنے کے لیے مڑے تو اب وہاں کوئی نہ تھا۔ انکل اقبال گاڑی کو لاک کر کے اندر سو کر اپنا خوف کم کر رہے تھے لیکن یہاں ان تینوں کے دل و دماغ میں خوف و ہراس نے اپنے پنجے مضبوط کر لیے۔

''ابھی تو رات بھی یہیں کاٹنی ہے، پیارو!'' ہر گزرتے پل کے ساتھ انہیں یہاں کسی پانچویں وجود کی موجودگی کا یقین ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے سورج غروب ہو رہا تھا ماحول میں ہولناکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ویڈیو کا کچھ حصہ شوٹ کرنے کے بعد انہوں نے اپنا کام روک دیا تھا۔ گہری ہوتی رات اور اس پر سیاہ آسمان پر چاند کی غیر حاضری وحشت کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ ان کی نظر پرانے کمرے کے لکڑی کے دروازے پر گئی تو وہاں سے تالا غائب تھا۔ چند لمحوں بعد دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ سامنے موجود بوڑھے کو دیکھتے ان تینوں کے رنگ لمحہ بھر میں اڑ گئے۔ مشکل سے خود میں ہمت پاتے عباس نے ذرا کی ذرا آنکھیں ان دونوں کی طرف کی تھیں۔ خوف سے سفید چہرے لیے وہ بھی ساکت تھے۔

بوڑھا قدم قدم چلتا قریب آنے لگا اور زمین پر بچھی چادر پر بیٹھ گیا۔

''کس کام سے آئے ہو؟''

''ہم تو ویڈیو بنانے آئے ہیں، آپ ادھر کیوں ہیں؟''

بہادر ہونے کی ناکام کوشش کرتا عباس اپنے چہرے پر سے خوف کے آثار نہ مٹا پا رہا تھا۔ ''میں تو 128 سال سے یہاں ہوں!'' بوڑھا طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''آپ 128 سال کے ہیں؟''

''حیرانی کیسی؟ کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''یہاں کیا کرتے ہیں؟''

''آنے والوں کو اپنے انداز میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

بوڑھا اور عباس ہم کلام تھے۔

''عباس؟ تجھے اس خوف ناک جگہ پر نیند آ رہی ہے۔ تھوڑی تو شرم کر؟'' تقی غصے میں اس کا کندھا ہلاتا اسے بلا رہا تھا جس نے آنکھیں کھولتے ہی زوردار آواز میں چیخ ماری۔ ''وہ۔۔۔ وہ بوڑھا کہاں گیا؟ 128 سال کا وہ بوڑھا؟''

ہکلاتے ہوئے عباس گویا ہوا۔ عباس کو احساس ہو گیا کہ وہ صرف ایک خواب تھا، خوفناک خواب۔ ''لڑکیوں کی طرح کیوں چیخ رہے ہو؟''

''تم تو حویلی میں بھی اتنا خوف زدہ نہیں ہوئے تھے۔ اب کیا ہوا ہے؟'' تقی اور شہیر باری باری اسے ڈانٹتے ہوئے ہوش دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''حویلی میں کچھ نہیں تھا۔ وہ آباد تھی وہاں لوگ رہ رہے تھے اور ویسے بھی اب مجھے یقین ہے کہ اجاڑ جگہوں پر جن آ ہی جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم یہاں سے واپس چلتے ہیں۔''

''اس کیمپ میں رات گزارنا اس راستے پر سے واپس جانے سے بہت بہتر ہے۔ ویسے بھی ہم شوٹنگ دوبارہ شروع کرنے لگے ہیں تاکہ یہ بوریت اور بلاوجہ کا ڈر کم ہو۔''

تقی نے صاف جواب دیا اور باہر آ کر کیمرے کے ساتھ بتی بھی لگانے لگا۔ اس نے سرسری طور پر اقبال انکل کو دیکھا جو ایک مرتبہ جاگ کر پھر سو رہے تھے، پتا نہیں اتنی نیند کیسے آ جاتی تھی انہیں۔ ویڈیو بنانے کے لیے مخصوص رنگ لائٹ لگاتے وہ فریم دیکھنے لگا جس کے پیچھے سیاہ سا کچھ کچھ اور بھی ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ رات کی تاریکی اور سیاہ سا کچھ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ تب ہی اسے اسٹینڈ کے پاس ایک چڑیا گری ہوئی نظر آئی جو دیکھنے پر مردہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے پَر ڈھلکے ہوئے تھے بالکل بے جان شے کی طرح۔ تقی اسے اٹھانے کے لیے جھکا تاکہ کہیں دور رکھ سکے۔ جیسے ہی اس نے چڑیا کو ہاتھ لگایا تو وہ ننھی چڑیا کانپتی ہوئی بھٹے کے پیچھے گم ہو گئی۔ تقی آنکھیں کھولے ماؤف ذہن کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

''شہیر! میری بات سنو!'' شہیر کو بازوؤں سے پکڑتے تقی ابھی پیش آنے والا واقعہ اسے سنا رہا تھا جب اچانک ہی رنگ لائٹ ہلکے سے دھماکے سے پھٹ گئی، روشن سی جگہ یک دم ہی اندھیر ہو گئی۔ کیمپ کے پاس لگی چھوٹی سی لائٹ کی روشنی ناکافی تھی۔ تقی کے پیچھے کھڑے شہیر نے تاریکی میں اپنے کندھے پر ہاتھ محسوس کیا، مڑتے ساتھ ہی وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ کالا سایہ اس پر جھکنے کو تھا جب تقی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو کھینچتے ہوئے اسے گھسیٹا تھا اور سایہ پل بھر میں غائب ہو گیا۔ ورنہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر وہ سایہ شہیر پر جھکتا تو اسے اپنے اندر ہی مدغم کر لیتا۔

انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ سایہ کبھی ان کے سامنے آتا اور تیزی سے ایک جانب کو غائب ہو جاتا اور پھر کسی دوسری سمت سے نکلتا ہوا مخالف سمت میں گم ہو جاتا۔ یہ کھیل جاری تھا، دونوں سانس روکے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے جب انہیں اچانک عباس کا خیال آیا۔ وہ کیمپ کی طرف بھاگے جہاں عباس بے ہوش گرا پڑا تھا۔

''ایک یہ ہمارا نازک دوست!''

شہیر نے آگے بڑھ کر اس کا سر اٹھایا۔ سر کی پچھلی جانب ہلکا سا خون تھا۔ تقی کی نظر قریب گری اینٹ پر پڑی۔ اس اینٹ پر بھی خون کا مدھم سا دھبہ تھا۔ ایک مرتبہ پھر کوئی ان کے عین پیچھے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گردن گھما کر دیکھتے ان کے سروں میں درد کی لہر

بقیہ صفحہ نمبر: 32

20 فروری

سیدہ اقرا اعجاز

ٹوں! ٹوں! ٹوں!

رات کے دو بجے فون کی بیل بجی تو مارتھا کی آنکھ کھل گئی۔ ''اُف! اتنی رات کو کون فون کر رہا ہے؟'' اس نے جھنجھلاتے ہوئے سوچا اور فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف کوئی عورت تھی، لیکن اس کی آواز میں کچھ تو ایسا تھا جسے سن کر مارتھا کو عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور کہا:

''جی میں مارتھا بول رہی ہوں، پیرانارمل انویسٹیگیٹر (غیر معمولی چیزوں کی تفتیش کرنے والی)۔ آپ کہیے، کس سلسلے میں فون کیا ہے؟''

دوسری طرف سے وہ عورت بولی:

''جی میں لورین جوزف بول رہی ہوں۔ میری بیٹی کیتھرین جوزف کو کچھ ہو گیا ہے۔ کچھ دنوں سے وہ بہت عجیب اور پراسرار حرکتیں کرنے لگی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں، پلیز، آپ میری مدد کریں، پلیز!''

مارتھا نے کہا:

''آپ بالکل بھی پریشان مت ہوں، میں اور میری ساتھی جولیا کل ہی آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ آپ پلیز ایڈریس لکھوا دیں۔''

لورین نے اسے ایڈریس بتایا جو اس نے ایک کاغذ پر لکھ لیا۔ یہ جگہ شہر سے تقریباً سو کلومیٹر کی دوری پر تھی۔ جب مارتھا نے صبح فون کر کے جولیا کو بتایا تو اس کو اتنی دور جانے کا سوچ کر ہی ہول اٹھنے لگے۔

''مارتھا! مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں وہاں جانا چاہیے، وہ جگہ شہر سے کتنی دور ہے۔ ہم تو آج تک وہاں گئے بھی نہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اور جیسا ابھی تم نے کہا کہ اس عورت کی آواز میں کچھ عجیب تھا۔'' جولیا کی بات سن کر مارتھا بولی:

''ہوں! سوچ تو میں بھی یہ ہی رہی ہوں، لیکن جولیا یہ ہمارا کام ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس بیچاری عورت کی مدد کریں۔ جب اس کی کال آئی تھی تو میں نیند میں تھی۔ ہو سکتا ہے اسی لئے مجھے اس کی آواز عجیب لگی ہو۔'' مارتھا کی بات سن کر جولیا نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ لیکن اس کا دل بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ منع کر بھی دیتی تو بھی مارتھا وہاں ضرور جاتی اور وہ اسے اتنی پراسرار جگہ پر اکیلے بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ آخر بچپن کی دوست جو تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ راضی ہو گئی۔ رات کے وقت جولیا اور مارتھا کار میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ مارتھا گاڑی چلا رہی تھی جبکہ جولیا آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ کار کے اندر ہیٹر چل رہا تھا جس کی وجہ سے سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک گاڑی چلتے چلتے ایک جھٹکے سے

رک گئی۔ جس جگہ گاڑی رکی تھی اس طرف قبرستان تھا۔ سڑک پر دُور دُور تک کچھ نہ تھا۔ جولیا کو تو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ مارتھا کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ مارتھا نے گاڑی میں سی این جی پہلے ہی بھروالی تھی۔ اس لئے سی این جی ختم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آخر ہمت کر کے مارتھا اور جولیا گاڑی سے اُتر آئے۔۔ مارتھا کار کی ڈگی کھول کر سوئچ وغیرہ چیک کرنے لگی۔ جب کہ جولیا ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ رات کا وقت، سنسان قبرستان، ہُو کا عالم، ایسا منظر جولیا نے آج تک صرف فلموں میں ہی دیکھا تھا۔ ''یار جولیا! سوئچ وغیرہ میں تو کوئی خرابی نہیں ہے۔ لیکن پتا نہیں کیوں گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔''

مارتھا کی بات سن کر جولیا کے چہرے پر خوف کا سایہ لہرایا۔ ایسی جگہ پر رات گزارنے کا تصور ہی اسے ہولا رہا تھا۔ مارتھا نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھے تو بولی:

''ارے یار! اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ ہوسکتا ہے یہاں سے کسی کا گزر ہو تو وہ ہمیں لفٹ دے دے اور قبرستان سے ڈرنے کی ضرورت تو بالکل بھی نہیں، آخر ہمیں مر کر یہیں تو آنا ہے۔ آؤ چلو، اندر چلتے ہیں قبرستان میں۔'' مارتھا جولیا کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے قبرستان کے اندر لے گئی۔

''مارتھا! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ پلیز قبرستان سے باہر چلو، مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔'' جولیا قبرستان کے اندر آتے ہی بولی تو مارتھا نے بھی اس کی حالت کو دیکھ کر ہاں میں سر ہلا دیا۔ اس قبرستان میں بہت ساری قبریں تھیں لیکن دو قبریں ایسی تھیں جنہیں اگر مارتھا دیکھ لیتی۔۔ تو یقیناً اسی وقت بے ہوش ہو جاتی۔ آخر کس کی تھیں وہ قبریں؟ وہ دونوں قبرستان سے باہر نکلیں اور گاڑی میں جا کر بیٹھ گئیں۔

حیرت انگیز طور پر اس دفعہ گاڑی ایک ہی دفعہ میں اسٹارٹ ہوگئی۔ جولیا نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب وہ دونوں ایک بار پھر منزل کی طرف بڑھنے لگیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئیں۔

یہ ایک گھنا جنگل تھا۔ جس کے بیچوں بیچ لورین جوزف کا گھر تھا۔ دور دور تک انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ گھر بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔ مارتھا اور جولیا گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ وہ دونوں گھر کے دروازے کے سامنے جا کر رک گئیں۔ کتنی دیر وہ ایسے ہی کھڑی رہیں پھر آخر ہمت کر کے مارتھا نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

''دیکھا مارتھا! میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ ہمیں یہاں نہیں آنا چاہیے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ یہاں تو شاید کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔'' جولیا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ مارتھا نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔ اس دفعہ دروازہ ایک خوبصورت عورت نے کھولا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا جو پیروں سے نیچے تک آتا تھا۔ لیکن اس میں ایک بات عجیب بہت تھی۔ اس کا رنگ حد سے زیادہ سفید تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر خون کا ایک قطرہ تک نہیں ہے۔ وہ عورت انہیں دیکھ کر مسکرائی۔ مسکرانے سے اس کے دانت نظر آنے لگے۔ دانت بہت سفید اور چمک دار تھے۔

''ہمیں مس لورین جوزف سے ملنا ہے۔ انہوں نے ہمیں یہاں بلایا ہے۔'' جولیا نے کہا تو وہ عورت بولی:

''میں ہی لورین جوزف ہوں اور میں نے ہی آپ دونوں کو یہاں بلایا ہے۔ اندر چلیے، باقی باتیں اندر ہوں گی۔'' جولیا اور مارتھا نے اندر کی طرف قدم بڑھائے۔

اس عورت نے ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ گھر اندر سے بھی بہت شاندار تھا۔ لورین انہیں بٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دو شیشے کے گلاس تھے جن میں گاڑھا گاڑھا لال شربت تھا۔ مارتھا نے شربت کا ایک گھونٹ بھرا تو اسے ابکائی آنے لگی۔ شربت کا ذائقہ بے حد عجیب تھا۔ لیکن مارتھا کو مجبوراً پورا گلاس خالی کرنا پڑا تاکہ لورین کو برا نہ لگے۔

جولیا کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ جب ان دونوں نے اپنے اپنے گلاس خالی کر دیے تو لورین ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر بات شروع کی:

''کیتھرین میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کے پاپا کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا، تب سے کیتھرین کو میں نے اکیلے ہی پالا ہے۔ کیتھرین یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور ایک لائق اسٹوڈنٹ ہے۔ آج سے تقریباً دو مہینے پہلے کیتھرین اپنے دوستوں کے ساتھ کسی جنگل میں کیمپنگ کے لیے گئی تھی۔ لیکن جب وہ لوٹی تو اس کا رویہ بہت عجیب سا تھا۔ نہ تو وہ پہلے کی طرح زیادہ بولتی تھی اور نہ ہی کچھ کھاتی پیتی تھی، میں نے اسے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن اس کی حالت بہتر نہ ہوسکی۔ آہستہ آہستہ اس کی شکل بھی عجیب ہوتی چلی گئی۔ میری خوبصورت کیتھرین کی شکل بگڑنے لگی۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ میری بیٹی نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ وہ رات کے بارہ بجے نیند سے اٹھتی ہے اور دیواروں کو اپنے ناخنوں سے کھرچنے لگتی ہے۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھ پیر ٹیڑھے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو وہ زندہ چوہے اور چھپکلیاں تک کھا جاتی ہے۔ مجھے کسی سے آپ دونوں کے بارے میں پتا چلا تو میں نے آپ سے رابطہ کیا۔ آپ دونوں نے بہت سارے ہارر کیسز کو ڈیل کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور میری مدد کریں گی اور میری بیٹی کو پہلے جیسا کر دیں گی۔''

لورین کی بات سن کر مارتھا نے کہا:

''جی بالکل ہم آپ کی مدد ضرور کریں گے، لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ شہر سے اتنی دور اس سنسان جگہ پر کیوں رہتی ہیں۔''

لورین بولی:

''دراصل میں تنہائی پسند ہوں، اس لیے شہر کے شور شرابے سے دور مجھے یہاں رہنا پسند ہے۔''

جولیا نے پوچھا:

''کیا کیتھرین کے کمرے میں سی سی ٹی وی کیمرا ہے۔''

''جی نہیں!'' لورین نے جواب دیا۔

''سب سے پہلے ہمیں آپ کے اور کیتھرین کے کمرے میں سی سی ٹی وی کیمرے لگانے ہوں گے۔'' مارتھا نے کہا۔

ان کے سامان میں سی سی ٹی وی کیمرے موجود تھے۔ وہ پہلے کیتھرین کے کمرے میں گئیں۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جیسا لورین نے کہا تھا وہ بالکل ویسی ہی نظر آتی تھی۔ مارتھا نے ایک اونچی جگہ پر کیمرہ سیٹ کر دیا جہاں سے پورے کمرے کا منظر دکھائی دے سکے، اس کے بعد وہ لورین کے کمرے میں گئی اور وہاں بھی کیمرہ سیٹ کر دیا۔ کیمرہ سیٹ کرنے کے بعد لورین نے انہیں ان کا کمرہ دکھا دیا جہاں وہ آرام کر سکیں۔ یہ ایک آرام دہ کمرہ تھا جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ انہوں نے بیگ سے بسکٹ وغیرہ نکال کر کھائے اور مانیٹر آن کر کے ریکارڈنگ دیکھنے لگیں۔ جہاں پر ایک طرف لورین کا اور دوسری طرف کیتھرین کا کمرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت سو رہی تھیں۔ مارتھا کی نظر مسلسل مانیٹر پر تھی جبکہ جولیا فون پر اپنے بھائی ڈیوڈ سے بات کر رہی تھی۔

''جولیا! تم اس وقت کس کا کیس ہینڈل کر رہی ہو؟'' ڈیوڈ نے پوچھا تو جولیا اسے بتانے لگی:

''مس لورین کا ان کی بیٹی کیتھرین پر شاید کسی آسیب کا سایہ ہے۔ یہ جگہ شہر سے سو کلومیٹر دور ہے۔'' اس سے پہلے کہ جولیا کچھ اور بولتی کال کٹ گئی۔ اس کے موبائل کے سگنل جا چکے تھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ جولیا نے بھی اپنی نظریں مانیٹر پر جما دی۔ اچانک ان دونوں نے اسکرین پر ایک عجیب منظر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ کیتھرین بستر پر سے اٹھی اور دیوار کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے دیوار کو کھرچنے لگی تھی۔ دیوار کو کھرچنے سے اس کے ناخنوں سے خون بہنے لگا۔ اسی وقت کیتھرین کے پاس سے ایک موٹا سا چوہا گزرا تو کیتھرین نے اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ چوہے کو اپنے ناخنوں سے نوچ نوچ کر کھا رہی تھی۔ ان دونوں نے اتنا خوفناک منظر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چوہے کو کھانے کے بعد وہ اپنی انگلیوں کو چاٹنے لگی، یہ کام کرنے کے بعد وہ دوبارہ دیواروں کو کھرچنے لگی۔ اس کے بعد انہوں نے نہایت حیرت انگیز منظر دیکھا۔

کیتھرین کی گردن خود بخود گول گول گھومنے لگی تھی جیسے کوئی مشین چل رہی ہو۔ اس کے بعد وہ کسی جانور کی طرح دونوں ہاتھوں اور پیروں پر چلنے لگی۔۔ اس کی گردن مسلسل گھوم رہی تھی اور وہ مسلسل ادھر ادھر دونوں ہاتھوں اور پیروں پر بھاگ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ اچانک نارمل ہو گئی لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔ اب وہ دونوں ہاتھوں اور پیروں کے سہارے دیوار پر چڑھنے لگی۔ چڑھتے چڑھتے وہ کمرے کی چھت تک پہنچ گئی۔ وہ اس طرح چھت پر چل رہی تھی۔ جیسے ایک چھپکلی چلتی ہے۔ اچانک وہ چھت سے نیچے کود گئی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ وہ دونوں سانس روکے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ بلاشبہ یہ منظر کسی ڈراؤنی فلم سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ جولیا کی تو ایسی حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، لیکن مارتھا نے اپنے حواسوں پر قابو میں رکھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے مانیٹر پر دیکھا کہ لورین کے کمرے کا دروازہ کھلا اور کیتھرین اندر داخل ہوئی۔ لورین بے خبر سو رہی تھی۔ کیتھرین کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر تھا۔ پھر ان دونوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کیتھرین جھکی اور لورین کے بال کھانے لگی۔ وہ بال اتنی رغبت سے کھا رہی تھی جیسے کھانا کھا رہی ہو۔ لورین ابھی تک گہری نیند میں تھی۔ بال کھانے کے بعد کیتھرین نے وہ تیز دھار خنجر لورین کے سینے میں گھونپ دیا۔

اچانک مارتھا جیسے ہوش میں آ گئی۔ ''جولیا! جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ کیتھرین اب یقیناً ہمیں آئے گی اور ہمارا بھی وہی حال کرے گی جو اس نے لورین کا کیا ہے۔'' وہ دونوں جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھیں اور دروازہ کھولنا چاہا لیکن یہ کیا؟ دروازہ تو باہر سے لاک تھا۔۔

ان دونوں کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ جولیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا، اندر آنے والی کو دیکھ کر ان کے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کیونکہ وہ کیتھرین نہیں بلکہ اس کی ماں لورین تھی۔ وہی لورین جسے ان کی آنکھوں کے سامنے کیتھرین نے مارا تھا۔

لورین کی شکل اس وقت بے حد بھیانک لگ رہی تھی۔ اس کے سینے میں خنجر پیوست تھا جس میں سے خون بھل بھل گر رہا تھا۔ اس کے منہ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ اسی وقت کیتھرین بھی اندر داخل ہو گئی، اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر موجود تھا۔ وہ دونوں بھیانک ہنسی ہنسنے لگیں۔ مارتھا اور جولیا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑیں۔

.....☆.....

جب جولیا کو ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی۔ مارتھا بھی اس کے برابر والے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ جولیا اور مارتھا کے والدین بھی وہاں موجود تھے۔ ان دونوں کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ بچ گئی ہیں۔ جولیا کے بھائی ڈیوڈ نے انہیں بتایا:

''جب میری جولیا سے بات ہوئی تو اس نے مجھے اس جگہ کے بارے میں بتایا تھا اور لورین اور کیتھرین کے نام بھی لیے تھے۔ تو بس میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پولیس لے

بقیہ صفحہ نمبر: 44

کرسمس کیک

عائشہ اطہر

وہ بونوں کا ایک بہت ہی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جہاں سب مل جل کر اور بہت پیار سے رہتے تھے۔ اُسی گاؤں میں ایک بہت خوبصورت گھر تھا۔ جس میں چار بہت پیارے بونے رہتے تھے جونی، ٹونی، ولیم اور جیکی۔ گھر کے بڑے بڑے کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ گھر کے ہال کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ مختلف رنگوں کی لائٹوں سے سجا تھا۔ شام ہوتے ہی جب وہ مختلف رنگوں کی لائٹیں جلتیں تو کمرہ رنگ برنگی روشنیوں سے بھر جاتا۔ بستی کے سب لوگوں کو وہ ہال بہت پسند تھا اسی لیے جب بھی کسی نے کوئی تقریب کرنی ہوتی تو اُسی ہال میں کرتے۔

کرسمس آنے والی تھی اور سب اُس کی تیاریوں میں مگن تھے۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اُس کا گھر سب سے خوبصورت لگے۔ کرسمس ٹری سب سے بڑا اور پیارا ہو۔ کیک سب سے مزیدار اور شاندار ہو۔ جونی، ٹونی، ولیم اور جیکی بھی کرسمس کے لیے پورا سال پیسے جمع کرتے رہے تھے، تاکہ اُن کی تیاریوں میں کوئی کمی نہ رہے۔ انہوں نے سارے ہی گھر کو بہت خوبصورتی سے سجایا تھا۔ پورے گھر میں نئے پینٹ ہوئے تھے۔ گھر چاروں طرف سے بند تھا جیسے کوئی قلعہ ہو۔ گھر کے بڑے بڑے دروازے اور بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں، جن سے روشنی چھن چھن کر پورے گھر میں داخل ہوتی تھی۔ گھر کے بیرونی حصے کو انہوں نے چھوٹی، بڑی سرخ، سبز نیلی، پیلی لائٹوں سے سجایا تھا۔ جب وہ رنگ برنگی لائٹیں جلتی بجھتی تھی تو رات کے اندھیرے میں بہت خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ جنگل سے اُن کے سب دوست بھالو میاں خرگوش، بلی، بندر، گھوڑا سب خاص طور پر گھر کی سجاوٹ دیکھنے آئے تھے اور وعدہ کر گئے تھے کہ کرسمس کیک وہ سب مل کر کاٹیں گے، اور مل کر کرسمس منائیں گے۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھی۔ صرف کرسمس ٹری پر کچھ لائٹس لگانی باقی تھی۔ سب گفٹ پیک ہو چکے تھے۔

''ایک بُری خبر ہے'' ٹونی نے کرسمس ٹری پر لائٹ لگاتے ہوئے کہا:

''سب پیسے ختم ہو چکے ہیں۔ صرف چار سو روپے بچے ہیں۔''

''ارے ابھی چار سو، ابھی تو ہم نے سٹی بیکری سے کیک بھی لینا تھا۔ سٹی بیکری اُس گاؤں کی سب سے مشہور بیکری تھی، جس کے کیک نا صرف بہت ہی مزیدار تھے بلکہ بہت مہنگے بھی تھے۔

''یہ تو واقعی بہت بُری خبر ہے۔ اب ہم کیا کریں گے'' ولیم سب کام چھوڑ کر ہال میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ایک کام کرو سب اپنی جیبیں چیک کرو اپنے اپنے کمروں میں جاؤ دیکھو شاید کچھ

پیسے اور کہیں رکھے ہوں۔'' جیکی نے تجویز پیش کی۔ سب نے اپنے اپنے کمروں کی طرف دوڑ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد سب دوبارہ ہال میں اکٹھے تھے۔ سب ہی کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔

''چلو جو جو کچھ ملا ہے باری باری میز پر رکھو۔ میرے پاس پچاس روپے ہیں'' جیکی نے پچاس روپے میز پر رکھے۔

''میرے پاس سو روپے ہیں'' ٹونی نے میز پر سو روپے رکھے۔

''میرے پاس بھی پچاس روپے ہیں، ولیم افسردگی سے بولا۔

''میرے پاس بھی سو روپے ہیں'' جونی نے بھی مڑا تڑا نوٹ نکالا۔

''یہ کُل ملا کر ہو گئے سات سو'' ولیم نے گنتی مکمل کی۔

''کیک کتنے کا ہے'' ٹونی نے پوچھا۔

''بڑا کیک لینا تھا۔ وہ تین ہزار پانچ سو کا تھا'' جیکی نے جواب دیا۔

''اُف! اب کیا ہوگا؟ کیک کیسے آئے گا؟ کیک کے بغیر کرسمس پارٹی کیسے ہوگی؟ سب مہمان ہمارا مذاق اُڑائیں گے۔'' جونی ایک ہی سانس میں بولا چاروں بونے اُداس اور افسردہ تھے۔ ہال کی سب بتیاں جل رہی تھی۔ رنگ برنگی لائٹوں سے کمرہ روشن تھا لیکن اُن سب کو ہر طرف اندھیرا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے اُن کے پاس کوئی حل نہ تھا، اُسی وقت بھالو میاں ہال میں داخل ہوئے ہاتھ میں چھوٹا سا شیشے کا مرتبان پکڑ رکھا تھا۔

ممی کھیر بنا رہی ہے اور چینی ختم ہوگئی۔ ''تھوڑی چینی ملے گی؟ کیا بات ہے منہ کیوں لٹکا رکھے ہیں۔'' بھالو میاں نے پوچھا۔

''کرسمس کیک لانے کے لیے پیسے بہت کم ہیں'' جونی افسردگی سے بولا۔

''اوہو! پھر اب؟'' بھالو میاں نے اگلا سوال کیا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا'' جیکی بولا۔

''مجھے چینی تو دو میرے پاس اس مسئلے کا حل ہے'' بھالو میاں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کر بولے۔

''وہ کیا؟'' چاروں بونے یک زبان چلائے۔

''کیک گھر میں بنالو۔'' بھالو میاں نے کہا۔

''سٹی بیکری جیسا کیک گھر میں، دماغ ٹھیک ہے'' ولیم نے جواب دیا۔

''آنٹی میری! سٹی بیکری میں کام کرتی ہیں اُن کے پاس پوری ترکیب ہے'' بھالو میاں نے اطلاع دی۔

''اور وہ ہمیں کیوں دیں گی ترکیب؟'' ٹونی نے سوال کیا۔

''ویسے تو شاید وہ ترکیب کبھی نہ دیتیں لیکن بات کرسمس کیک کی ہے تو وہ انکار نہیں کریں گی۔ بھالو میاں چینی لیتے ہوئے بولے۔

''چلو! پھر آنٹی میری کے گھر چلتے ہیں'' جیکی جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

''کیا سچ مُچ! ایسا نہ ہو ہم سب کی پٹائی ہو جائے۔'' جونی ڈرا ہوا تھا۔

''نہیں کچھ نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا منع کر دیں گی آنٹی میری ہمیں یہ چانس لینا چاہیے۔'' ٹونی نے سب کی ہمت بندھائی۔ چاروں آنٹی میری کے گھر کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچے تو آنٹی میری کوکونٹ کیک بنا رہی تھی کیک دیکھ کر چاروں کے مُنہ میں پانی آ گیا۔

''دیکھو بچو! کیسا لگ رہا ہے کیک؟'' آنٹی میری کیک پر کریم لگا رہی تھی۔

''واہ واہ! آنٹی میری شاندار! اس پورے شہر میں آپ جیسا کیک کوئی نہیں بنا سکتا۔'' جیکی بولا۔

''ہم لڑکے! مکھن لگا رہے ہو؟ بتاؤ کام کیا ہے'' آنٹی میری مسکرائی۔

''نہیں آنٹی! جیکی مکھن نہیں لگا رہا۔ آپ جیسا کیک سچ میں کوئی نہیں بنا سکتا'' ٹونی نے بھی مکھن لگایا۔

''اچھا! چلو ٹھیک اس کیک میں سے میں تم لوگوں کا حصہ بھی رکھوں گی۔'' آنٹی میری خوشدلی سے بولیں۔

''آنٹی میری! ایک بہت چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا ہے'' ولیم نے ساری بات آنٹی میری کو بتائی۔

''دیکھو پیارے بچو! کوئی اور موقع ہوتا تو میں تم لوگوں کو کبھی کیک کی ترکیب نہ دیتی لیکن کرسمس ہے اور تم لوگ سب کو دعوت بھی دے چکے ہو تو میں تم لوگوں کو کیک کی ترکیب ضرور بتاؤں گی'' آنٹی میری خوشدلی سے بولیں۔

''چلو چیزیں لکھو'' آنٹی میری نے کیک بنانے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی لکھوائیں اور سمجھانے لگی کہ کس طرح کیک بنے گا۔

''جونی اور جیکی تم لوگ سب سامان لے آؤ، تب تک میں اور ٹونی باقی سامان تیار کرتے ہیں'' ولیم بولا۔

جونی اور جیکی بازار روانہ ہوئے اور تھوڑی دیر میں ہی لدے پھندے گھر واپس پہنچ گئے۔ ''جیکی تم چاکلیٹ کریم تیار کرو تا کہ جب تک کیک تیار ہو چاکلیٹ کریم بن کر ٹھنڈی ہو چکی ہو'' ولیم نے جیکی کو کہا۔

''جونی تم انڈے پھینٹو اور ٹونی تم چینی لاؤ میں میدہ نکال لوں'' ولیم نے سب کو کام بتائے۔

کیک بننے کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ سب پُر جوش تھے اور خوش بھی کہ اُن کے پاس ''سٹی بیکری'' کے مشہور کیک کی ترکیب ہے اور وہ انتہائی کم قیمت میں ایک بہترین کیک بنائیں گے اور کرسمس کی دعوت میں سب اُس کیک سے لطف اندوز ہوں گے۔

جونی کتنے انڈے پھینٹ رہے ہو؟ ولیم نے پوچھا۔

''دس'' اور دس کہتے ہی ایک چھوٹے سے دھماکے کی آواز آئی۔ انڈوں کا شاپر زمین پر گر گیا تھا۔ سب انڈے ٹوٹ گئے تھے۔

''اُف! سب انڈے توڑ ڈالے'' جیکی چلایا۔

''تم نے انڈے نہیں توڑے سمجھو ہمارا دل توڑ دیا'' ٹونی افسردگی سے بولا۔

''میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا؟ جونی رو دینے کو تھا۔

''اب انڈوں کے بغیر کیک کیسے بنے گا؟'' ولیم پریشانی سے بولا۔

''کیک کے سامان میں سے دو سو روپے بچے ہوئے ہیں'' ٹونی نے جواب دیا۔

''کیا واقعی! ولیم خوشی سے چلایا۔

''جی ہاں'' ٹونی نے خوشی سے اقرار کیا۔

''تو کھڑے کیوں ہو بھاگو لے کر آؤ۔'' ولیم نے اُسے دوبارہ انڈے لینے بھیجا۔

''ایک سوال پوچھنا ہے'' جیکی معصومیت سے بولا۔

''سوال ضرور پوچھو پر کوئی نئی مصیبت نہ بتانا'' ولیم نے کہا۔

''کیا چاکلیٹ کریم بغیر کوکو پاؤڈر کے بن جائے گی؟''

''کیا'' ولیم اور جونی اکٹھے چلائے ''کوکو پاؤڈر نہیں خریدا؟'' جونی بولا۔ دوکاندار سے تو کہا تھا پر سامان میں نہیں نکلا'' جیکی آہستہ آواز میں افسردگی سے بولا۔

''لگتا ہے یہ کیک نہیں بن سکے گا۔ ولیم مایوس ہو چکا تھا۔

''اب کیا کریں؟'' جونی نے سوال کیا۔

''ایک آئیڈیا ہے'' جیکی بولا۔

''کیا'' ولیم نے پوچھا ''ہم آنٹی میری سے کوکو پاؤڈر اُدھار مانگ سکتے ہیں۔'' جیکی نے آئیڈیا دیا۔

''واہ! شاندار آئیڈیا میں ابھی لے کر آیا'' جونی کوکو پاؤڈر لینے بھاگا۔ تھوڑی دیر میں انڈے اور کوکو پاؤڈر دونوں موجود تھے۔ کیک بنانے کا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہو چکا تھا۔ چاروں بونے پوری محنت سے کیک بنانے میں مگن تھے۔ ٹھیک دو گھنٹے میں بے حد لذیذ کیک تیار ہو چکا تھا، جو دیکھنے میں بھی بہت شاندار تھا۔

''تھک گئے'' جیکی ہال کے صوفے پر گرتا ہوا بولا۔

''ہاں! لیکن سب بہت بہترین ہو گیا، کرسمس ٹری بہت اچھا لگ رہا ہے اور سب گفٹس بہت اچھے پیک ہوئے ہیں۔ ٹونی کرسمس ٹری کے اردگرد رکھے گفٹس دیکھتا ہوا بولا۔ ''کیک کی خوشبو اتنی زیادہ آرہی ہے کہ بھوک لگ رہی ہے'' جونی چابیاں ہوا میں اُچھالتا بولا۔ ''پچھلے لان سے سیب توڑ لاؤ سب کھاتے ہیں'' ٹونی نے چابیاں اُچھالتے جونی سے کہا۔

جونی سیب لے کر آیا سب نے مل کر خوب میٹھے سیب کھائے۔

''باہر موسم بہت اچھا ہے۔'' ولیم نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

''آؤ باہر چل کر دیکھتے ہیں گھر کی سجاوٹ کیسی لگ رہی ہے ویسے بھی تھوڑی دیر میں مہمان آنے شروع ہو جائیں گے اور تیار بھی ہونا ہے۔'' جیکی بولا۔ چاروں بونے گھر سے باہر آگئے۔ گھر بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ گھر پر لگی لائٹس اندھیرے میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''لو بھئی کھیر تیار ہو گئی ممی نے کہا تھا کہ جلدی سے دے آؤں۔ کیوں کہ پھر تم لوگوں کی دعوت میں آنے کے لیے تیار بھی ہونا ہے'' بھالو میاں کھیر کا ڈونگا پکڑاتے ہوئے جلدی جلدی بول رہے تھے۔

''واہ کھیر! بھوک بھی بہت لگی ہے۔ دعوت کے کھانے میں تو ابھی کافی وقت ہے۔ تب تک یہ مزیدار کھیر اُڑائی جائے'' جیکی خوشی خوشی بولا۔

''چلو اندر چلیں، پر یہ دروازہ تو بند ہو گیا گھر کا۔ جیکی بولا۔

''جونی چابی دو'' جیکی جونی کی طرف مڑا کونسی چابی جونی بولا۔ ''گھر کی چابیاں تم ہال میں لیے ہوا میں اُچھال رہے تھے۔ جیکی نے تھوڑے غصے میں بات مکمل کی۔

''وہ...... وہ چابیاں تو وہیں رہ گئیں پچھلے لان میں جب میں سیب توڑنے گیا۔'' جونی ہکلاتے ہوئے بولا۔

''اُف! اب ہم اندر کیسے جائیں گے'' مائیکل چلایا۔

''اوہو! مشکل کیا ہے؟ انکل نام جو چابیاں اور تالے بناتے ہیں اُن کو بلا لاؤ، وہ ابھی چابی تیار کر دیں گے'' بھالو میاں نے چٹکی بجاتے مسئلہ حل کیا۔

''لیکن انکل نام تو کرسمس کی چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں اپنے بچوں کے پاس گئے ہیں۔''

''اب ہم دعوت میں نہ آئیں؟'' بھالو میاں نے معصومیت سے سوال کیا۔ جونی، ٹونی، ولیم، جیکی ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''تالا توڑ دو'' بھالو میاں نے ایک اور مشورہ دیا۔

تالا نہیں توڑ سکتے کیوں کہ دادی لناں نے اس پر خاص منتر پھونک رکھا ہے۔ چابی لگے گی تو ہی کھلے گا'' ٹونی بولا۔

''کیا ہم کرسمس پارٹی نہیں کر سکیں گے؟'' جیکی پریشانی سے بولا۔ اُسی وقت وہاں سے شیر کی خالہ بلی گزر رہی تھی۔

''کیا ہوا بچو کیوں پریشان ہو؟'' خالہ بلی نے سوال کیا۔

''رات کو کرسمس پارٹی ہے گاؤں کے سب لوگوں نے آنا ہے کیک تیار ہے، اور اندر ہے لیکن دروازہ بند ہو گیا ہے۔ چابی گھر کے پچھلے لان میں ہے اور اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' جیکی نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی۔

بقیہ صفحہ نمبر: 29

پیپل کا بھوت

ارسلان اللہ خان

کراچی میں پیپل کا تھا اِک شجر
جو دراصل تھا ایک بُھتنے کا گھر

وہاں ایک بچے نے دیکھا تھا بھوت
مگر اس سے سب مانگتے تھے ثبوت

نظر آتا جب بھوت اُس پیڑ پر
اُسے دیکھ کر سب کو لگتا تھا ڈر

ڈراتا تھا سب کو جمعرات کو
شرارت یہ کرتا تھا وہ رات کو

کبھی بنتا بلّی کبھی چھپکلی
سنو بچو! ڈرتے تھے اس سے سب ہی

نشانہ بنے لوگ جب بھوت کا
تو بچنے کا اس سے کیا فیصلہ

وہاں پر تھے مسجد کے اِک مولوی
گئے ان کے ہاں لوگ مل کر سب ہی

انہوں نے دعا کو اٹھائے جو ہاتھ
علاقے کے سب لوگ تھے اُن کے ساتھ

وہ پہنچے جو پیپل کے پودے کے پاس
تو پھر بھوت نے بھی نکالی بھڑاس

بنا بھوت جب ایک لمبا سا ناگ
گئے خوف کے مارے سب لوگ بھاگ

مگر سامنے آگئے مولوی
وہ پڑھتے تھے آیات قرآن کی

سنا بھوت نے جب خدا کا کلام
ہوا کام اس بھوت کا سب تمام

سنو دوستو! بھوت نے یہ کہا
شرارت سے اب باز میں آگیا

کسی کو بھی اب نہ ستاؤں گا میں
ہر اِک فرد کے کام آؤں گا میں

تعلق جو رکھے گا قرآن سے
بچے گا وہ ہر ایک شیطان سے

جو پڑھتے ہیں قرآن کو سربسر
نہیں ان کو لگتا کسی سے بھی ڈر

سنو! تم سے کہتا ہے یہ ارسلاں
بنالو کلامِ خدا حرزِ جاں

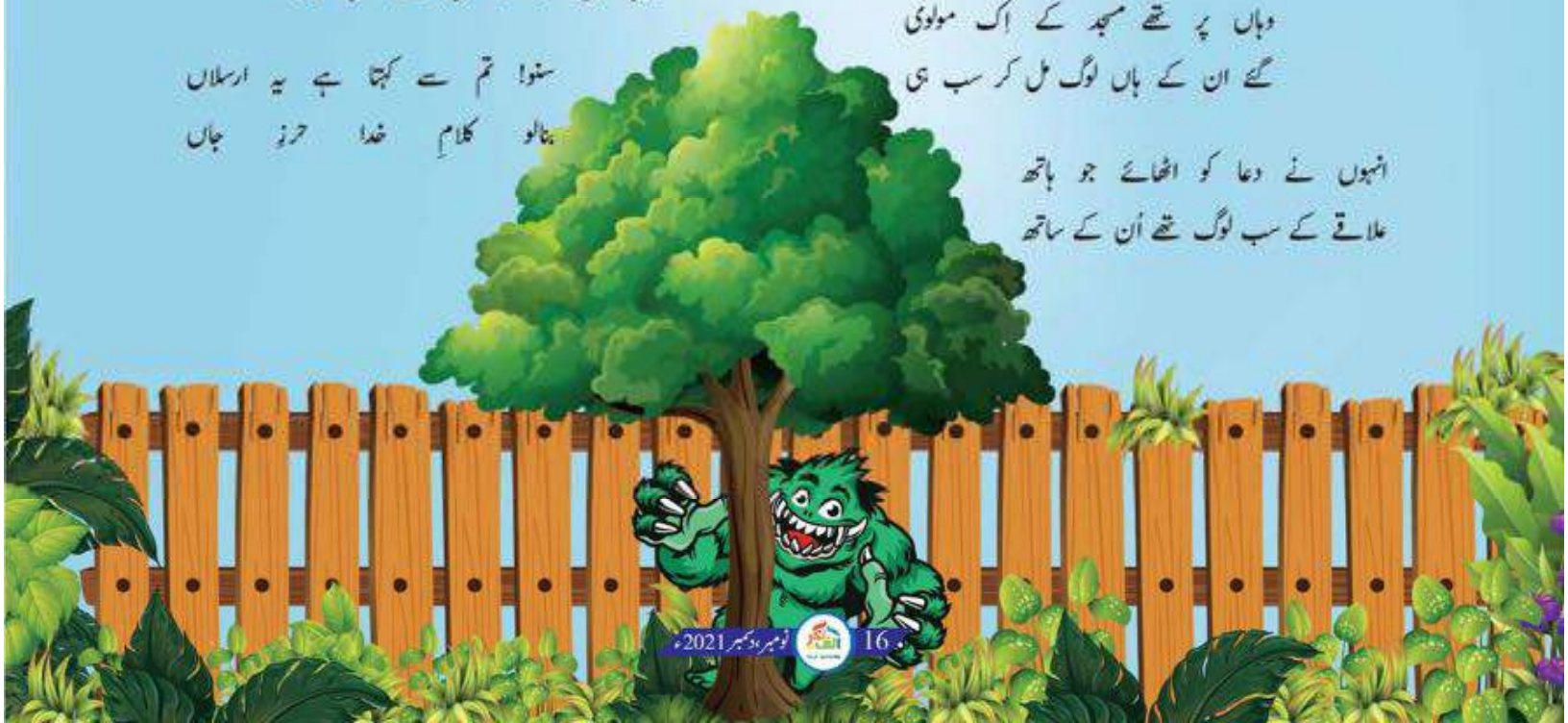

شام سے پہلے

الطاف حسین

سقوط ڈھاکہ 1971ء کے حوالے سے خصوصی تحریر۔ ایک ایسے نوجوان کا قصہ عبرت جو اپنی اصل راہ سے بھٹک گیا تھا اور پھر.....

فلائٹ روانہ ہونے میں اب صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ خوف و دہشت کی تصویر بنے، پریشان حال بہاری ڈھاکہ ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بھیڑ بکریوں کی طرح ایک دوسرے سے چپکے بیٹھے تھے۔ ذرا سا کھٹکا بھی ہوتا تو سب کی نگاہیں بے اختیار چاروں طرف گردش کرنے لگتیں اور دلوں کی دھڑکنیں انجانے خوف کے احساس سے اور تیز ہو جاتیں۔ کسی کونے سے ہلکی سی سرگوشی بھی سنائی دیتی تو دہشت زدہ مائیں سہم کر اپنے بچوں کو سینے سے چمٹا لیتیں۔ آنے والے وقت کا کوئی اعتبار نہ تھا، کسی بھی لمحہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انھیں ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت کی گردش رک گئی ہو۔ ٹریفک اسٹاف کی وردی میں ملبوس حمید ایک کونے میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں سب کے چہروں کا طواف کر رہی تھیں۔ لوگوں میں پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب دیکھ دیکھ کر اسے بہت سکون محسوس ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پھیلی پراسرار مسکراہٹ بھی اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔

کٹے پھٹے خون آلود جسم، سرخ سُرخ گاڑھا لہو، اذیت و کرب کے مناظر، بے بسی اور بے چارگی کی تصویریں اور دہشت سے پھٹی آنکھیں دیکھتے دیکھتے اب وہ بھی فطرتاً اذیت پسند بن چکا تھا۔ جب سے وہ ''مکتی باہنی'' میں شامل ہوا تھا۔ اس کے جنون میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے تنظیمی ساتھیوں کے ساتھ مل کر ''پاکستان ایک ہے۔'' کا نعرہ لگانے والوں کے خون سے ہاتھ رنگنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اس نے کئی گھر لوٹے تھے۔ ''مارو مارو۔'' کا نعرہ لگاتے ہوئے سیکڑوں بے گناہ ہم وطنوں کو بندوق کی سنگین میں پرویا تھا۔ پاک فوج کے قافلوں کو گھات لگا کر ختم کیا تھا۔ ریل گاڑیوں، پل اور سڑکیں تباہ کی تھیں۔ بندرگاہوں پر کھڑے بحری جہازوں کو بارود سے اڑایا تھا۔ بھارتی فوج کی نقل و حمل کے لیے کشتیاں چرائی تھیں۔ وہ کون سا ظلم تھا اور وہ کون سا جرم تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔ ابتدا میں جب وہ ''مکتی باہنی'' میں آیا تھا تو غیر بنگالیوں (بہاریوں) کا لہو دیکھ کر چیختا تھا ''کیا ہماری سنہری سرزمین کے ریشوں کی قیمت یہی ہے؟'' اس لمحے اچانک اس کے مرحوم باپ کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آجاتا ''کیا میں نے تجھے اسی لیے تعلیم دلائی تھی؟ کیا ہم اپنا سب کچھ لٹا کر اس پرچم تلے اسی لیے جمع ہوئے تھے کہ ہماری آنے والی نسلیں خود اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کا خون بہا کر اس پرچم کے وقار کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ بول تُو ایسا کیوں کرتا ہے؟ کس نے پڑھایا ہے تجھے ظلم کا یہ سبق؟ جواب دے کون ہے وہ؟'' اور پھر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا بوڑھا باپ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے، لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا اور وہ بلند آواز سے بڑبڑاتے ہوئے اپنے باپ کو کوسنے لگتا اور پھر زیادہ شدت سے لوٹ مار اور قتل و غارت کرتا تھا۔ ''مکتی باہنی'' کے کارندے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی رگوں میں دشمن کے گھولے ہوئے زہر کا اثر بھی تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اب اسے محبِ وطن باپ کا ہیولا بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاید وہ بھی نفرتوں کی تباہ کن طغیانی میں بہ کر کہیں دور بلکہ بہت دور نکل گیا تھا۔

حمید کو اب ''مکتی باہنی'' میں پاکستان دشمن کی علامت کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ ہندو بنیا بھی بنگالیوں کی جذباتی فطرت سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس کے مذموم مقاصد کی تکمیل کی راہیں تیزی سے ہموار ہوتی جا رہی تھیں۔ جس خواب کی تعبیر اسے ستمبر 1965ء میں نصیب نہ ہو سکی تھی وہ اسے یہاں مکمل ہوتی دکھائی دے رہی تھی اور پھر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بنگالیوں کو اپنی دہشت گرد تنظیم ''مکتی باہنی'' کے ذریعے پاکستان کو کاٹ

کر بھارت کے پانچویں حصے کے بجائے دسویں حصے کے برابر کر دیا تھا۔ اس کی نظر میں اب پاکستان اقتصادی لحاظ سے کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کے سپاہیوں کا دم خم ختم ہو چکا تھا اور پاکستانی دنیا کی ذلیل اور رسوا ترین قوم بن کر رہ گئے تھے، ان کا سب کچھ ڈوب چکا تھا۔

جنگ کے بعد جب عالمی امن کمیٹی کی کوششوں سے غیر بنگالی (بہاریوں) کے بنگلہ دیش سے انخلا کا اعلان ہوا تو کیمپوں میں موجود بہاریوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اسے سب سے پہلے اس قتل گاہ سے باہر نکالا جائے۔ پہلی پرواز سے روانہ ہونے والوں کی فہرست تیار ہو چکی اور انھیں ڈھاکہ ائیر پورٹ پر پہنچا دیا گیا تھا۔ انہیں آزاد دنیا میں لے جانے کے لیے ہوائی جہاز بھی "رن وے" پر اتر چکا تھا۔

حمید کے لیے یہ خبر ایک کھلا چیلنج تھی۔ وہ ہر قیمت پر اس عمل میں رکاوٹ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا اور پھر ایک انتہائی ہولناک منصوبے نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا جس کے نتیجے پر غور کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اب وہ پرسکون تھا۔

وہ وقت ضائع کیے بغیر "مکتی باہنی" کے ضلعی ہیڈ کوارٹر پہنچا اور اپنا منصوبہ ہندو انچارج کے گوش گزار کیا تو اس نے "سونار بنگلہ" کے منحرف بیٹے کو تعریف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی نئی "خدمت" کو خوب سراہا اور حمید کی گردن غرور سے تن گئی۔

.....☆.....

اچانک حمید تیزی سے ریستوران کے کاؤنٹر کے ساتھ بنے ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہوا اور ریسیور اٹھا کر کسی کا نمبر ڈائل کیا۔ چند سیکنڈ بعد کال مل گئی۔

"ہیلو رام لعل اسپیکنگ!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ یہ وہی رام لعل تھا جس کے ساتھ مل کر حمید نے مخالفین کے خلاف کارروائیاں کی تھیں۔

"کیا حال ہے؟" حمید نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں تم سناؤ؟" رام لعل نے کہا۔

"بات بنی یا نہیں؟" حمید کے لہجے میں بے تابی کی جھلک تھی۔

"ہاں! بات تو بن گئی ہے۔" رام لعل نے خوشی سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔

چند منٹ تک سرگوشیوں میں باتیں کرنے کے بعد حمید نے ریسیور رکھ دیا اور ٹیلی فون بوتھ سے باہر آ گیا۔ اس کی تیز نظریں لاؤنج میں بیٹھے بہاریوں کے چہروں کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاؤنج کے ایک کونے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں ایک بہاری خاتون اپنی آٹھ سالہ بچی کے ساتھ سب سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ معصوم صورت بچی ہر آنے جانے والے کو تجسس بھرے انداز میں یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ ان چہروں میں کوئی اپنا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"ہیلو بے بی ثانیہ! کیسی ہو تم؟" حمید بچی کے قریب جا کر اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

بچی کی ماں نے اسے مشکوک نظروں سے گھور کر دیکھا۔

"معاف کیجیے گا مسز محمود۔" حمید کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

"آپ سوچ رہی ہوں گی کہ میں کون ہوں اور بن بلائے آپ کے پاس کیوں آ گیا ہوں؟ میرا نام حمید ہے اور میں محمود صاحب کا پرانا دوست ہوں۔ شاید انھوں نے کبھی آپ سے میرا ذکر نہ کیا ہو لیکن میں ثانیہ کو ضرور جانتا ہوں کیونکہ ایک بار محمود صاحب نے مجھے اس کی تصویر دکھائی تھی اور میں ثانیہ کو پہچاننے کے بعد آپ کے قریب آیا ہوں۔"

"وووو..... وو..... وہ تو....." مسز محمود کے چہرے پر دکھ کی ایک لکیر آئی اور گزر گئی۔

"ہاں مجھے علم ہے لیکن ان دنوں میں یہاں نہیں تھا ورنہ میں ضرور آپ کے گھر آتا۔ میں کل ہی مغربی پاکستان سے واپس آیا ہوں۔ مجھے ان کی وفات کا بہت افسوس ہے اللہ کے کاموں میں انسان دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ صبر کیجیے اللہ بڑا کرم کرنے والا ہے۔" حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"انکل! آپ میرے ابو کے دوست ہیں؟" ثانیہ نے حمید کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں.... میں آپ کے ابو کا دوست ہوں۔" حمید بولا۔

"پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں اور واپس کب تک آ جائیں گے؟" ثانیہ اسے پرامید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"امی مجھے روز کہتی ہیں وہ بہت دور گئے ہوئے ہیں۔ جلد ہی واپس آ جائیں گے اور تمھارے لیے بہت سے کھلونے بھی لائیں گے۔ میں ہر روز شام ہوتے ہی دروازے کے باہر بیٹھ جاتی تھی اور بڑی دیر تک اپنے ابو کا انتظار کرتی تھی لیکن وہ آتے ہی نہیں۔ شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ انکل! پلیز آپ انھیں منا کر لے آئیے نا انھیں بتائیے کہ ثانیہ کو کھلونوں کی نہیں صرف آپ کی ضرورت ہے۔"

ثانیہ کی معصومانہ باتیں سن کر حمید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس کا دل نہ چاہتے ہوئے بھی پسیج گیا، لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی اور وہ دوبارہ اپنے "مقصد" کی طرف لوٹ آیا۔

"ثانیہ! آپ کے ابو ایک ضروری کام سے ملک سے باہر گئے ہیں۔ آپ فکر نہ کرو وہ بہت جلد آپ سے ملیں گے لیکن یہاں نہیں بلکہ مغربی پاکستان میں۔"

"سچ انکل؟" ثانیہ کا چہرہ بیک وقت حیرت اور خوشی سے کھل اٹھا۔

"ہاں! بالکل سچ۔ میں آپ سے جھوٹ تو نہیں بول رہا۔" حمید اسے پیار کرتے

ہوئے بولا ''ثانیہ! آپ کی گڑیا تو بہت خوب صورت ہے۔''

''یہ مجھے میرے ابّو نے لا کر دی تھی۔'' ثانیہ نے فخریہ انداز میں کہا۔

کچھ ہی دیر میں حمید دونوں ماں بیٹی کو اعتماد میں لے چکا تھا۔

''آؤ ثانیہ! کھلونوں کی دکان پر چلتے ہیں۔'' حمید ثانیہ کی انگلی تھامتے ہوئے لاؤنج میں موجود ایک اسٹال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا اور ثانیہ خوشی خوشی اس کے ساتھ چل پڑی۔ مسز محمود کی نظریں ان کے تعاقب میں تھیں۔

''انکل! غنڈوں نے ہمارا گھر بھی جلا دیا ہے۔ وہ بہت گندے لوگ ہیں۔ بچوں کو مار بھی دیتے ہیں۔ کیا ایسا ظلم کرتے وقت انھیں اپنے بچوں کا بالکل بھی خیال نہیں آتا؟''

ثانیہ اپنی دھن میں بولے چلی جا رہی تھی۔

''میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' حمید نے نظریں چراتے ہوئے گول مول سا جواب دیا۔

''آپ کو پتا ہے اللہ تعالیٰ جب ایسے گندے لوگوں کو بہت بڑے تندور میں جلائے گا تو پھر انھیں پتا چلے گا کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں۔'' ثانیہ کے منہ سے یہ انکشاف حمید کو نیا نیا سا لگا۔ خوف کے مارے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حقیقت اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ اس کی باطل روح سے آ ٹکرائی تھی۔ اس نے خوف سے ایک جھرجھری لیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شیطانی قوتیں پھر میدان میں آ گئیں اور حمید ذہن میں ابھرنے والے خوفناک تصورات کو نظر انداز کرتا ہوا قدرے تیزی سے کھلونوں کی دکان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں ایک مکروہ شکل شخص اس کا منتظر تھا۔ دونوں نے اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور پھر اس شخص نے پہلے سے تیار شدہ گفٹ پیک حمید کے حوالے کر دیا۔

''ثانیہ! یہ رہا آپ کا تحفہ۔'' حمید گفٹ پیک ثانیہ کو تھماتے ہوئے بولا۔ ثانیہ نے جلدی سے گفٹ پیک کھولا اندر ایک خوب صورت گڑیا موجود تھی۔

''واہ! اب تو میرے پاس دو گڑیا ہو گئی ہیں۔'' ثانیہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے بعد حمید اسے ساتھ لے کر واپس اسی جگہ آ گیا جہاں مسز محمود بیٹھی تھیں۔

''امّی! انکل بہت اچھے ہیں اُنھوں نے مجھے نئی گڑیا لے کر دی ہے۔'' ثانیہ اپنی امّی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

مسز محمود نے نئی گڑیا کو ایک نظر دیکھا اور حمید کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

''بھائی! آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا۔ ثانیہ کے پاس پہلے سے ایک گڑیا موجود تو تھی۔''

''ارے بھابھی! کوئی بات نہیں۔'' حمید مسکراتے ہوئے بولا۔

''انکل! آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بھی گندے لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ایک دن ان کی طرح.....'' ثانیہ نے کہتے کہتے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ثانیہ کی معصوم التجا نے حمید کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔

''ہاں ہاں! جہاں آپ جا رہی ہو میں بھی وہاں ضرور آؤں گا، لیکن اگلے ہوائی جہاز سے۔'' حمید نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات بنانے کی کوشش کی۔

''انکل! ڈرنے ورنے کی ضرورت نہیں جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ وہ آپ کا گھر نہیں جلائیں گے۔ میں انھیں بتا دوں گی کہ آپ میرے ابّو کے بہت ہی اچھے دوست ہیں۔''

''بہت ہی اچھے۔'' حمید نے سوچا اور اگلے لمحے اس کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔

وہ ثانیہ کو مسز محمود کے حوالے کرنے کے بعد آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاؤنج سے باہر نکل آیا۔ اس کا دماغ اندر سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔

''ان محبت کے متلاشی بچوں کا کیا ہوگا؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ کب تک تم ہماری معصوم نسلوں کے ماتھے پر یتیمی کا داغ لگاتے رہو گے؟ آخر کب تک؟'' آج بڑے دنوں بعد اس کے مرحوم باپ کا ہیولا پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا ''کب تک تم بے گناہ انسانوں کے وجود کو ظلم کی چکی میں پیستے رہو گے؟ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا ہی گھر پھونک ڈالا ہے، تم ظالم نہیں ہو تو اور کیا ہو؟''

حمید کو تصور کے پردے پر آج اپنا باپ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

''تم میرے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتے۔ تم نے اپنی زبان، اپنے ہاتھ اور اپنا سارا وجود ہی دشمن کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ تم نے ان لوگوں کے اشاروں پر اپنی قبر انگاروں سے بھری ہے جو ازل سے ہمارے دشمن تھے، ہیں اور رہیں گے۔ یہ بات تو تم بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو حمید الحق۔ تم جیسے جذباتی نوجوانوں نے اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹ کر وہ راہیں ہموار کیں جن پر چل کر دشمن نے وہ سفر لمحوں میں طے کر لیا جو وہ صدیوں میں بھی طے نہ کر سکتا تھا۔''

حمید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''بولو بولو..... جواب دو، خاموش کیوں کھڑے ہو؟'' حمید کا باپ غصّے سے چیخ رہا تھا اور وہ خاموش تھا۔ اس کے پاس اپنے باپ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''خواتین و حضرات! توجہ فرمائیے۔ کراچی جانے والی پرواز روانگی کے لیے تیار ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ گیٹ نمبر دو کے راستے جہاز پر تشریف لے چلیں شکریہ۔''

اچانک اناؤنسر کی آواز نے حمید کو چونکا دیا۔ وہ تیزی سے مڑا اور واپس لاؤنج میں آ گیا۔ اس کی نگاہیں ثانیہ کو تلاش کر رہی تھیں لیکن وہ لاؤنج میں موجود نہیں تھی۔ وہ قطار میں

بقیہ صفحہ نمبر: 71

جِن کے تین سنہری بال

سارہ قیوم

کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایسا بیمار ہوا کہ کسی دوا سے ٹھیک نہ ہوا۔ حکیموں نے کہا:

''اگر بادشاہ کو جن کے تین سونے کے بال پیس کر کھلائے جائیں تو ٹھیک ہو جائے گا۔'' لیکن جن کے بال لائے کون؟ آخر دور دیس سے ایک شہزادہ آیا اور اس نے جن کے تین سونے کے بال لانے کا وعدہ کیا۔ جن بہت دور ایک پہاڑ پر اپنی نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ شہزادہ پہاڑ کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک شہر میں پہنچا۔ اس شہر کے لوگ بہت اُداس تھے۔ شہزادے نے پوچھا:

''تم لوگ اتنے اُداس کیوں ہو؟

انہوں نے جواب دیا:

''ہمارے شہر میں ایک بہت بڑا فوارہ ہے جس کا پانی شہد کی طرح میٹھا ہے۔ سارا شہر اسی فوارے سے پانی لیتا ہے۔ اب کچھ دنوں سے فوارے میں پانی آنا بند ہو گیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟''

شہزادے نے کہا:

''میں جن کے تین سنہری بال لانے جا رہا ہوں۔ اگر ہو سکا تو تمہارے اس مسئلے کا حل بھی تلاش کرا لاؤں گا۔''

شہر کے لوگوں نے شہزادے کو ایک خوب صورت ہیروں کا ہار تحفے میں دیا۔ شہزادہ دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ سفر کے دوران وہ ایک اور شہر میں پہنچا جہاں کے لوگ بہت پریشان تھے۔ شہزادے نے پوچھا:

''تم لوگ پریشان کیوں ہو؟''

انہوں نے جواب دیا:

''ہمارے شہر میں ایک بہت بڑا انار کا درخت ہے جس پر بے حد میٹھے اور رس دار انار لگتے ہیں۔ اب وہ درخت مرجھا رہا ہے۔ سمجھ نہیں آتی اس کو کیا ہو گیا ہے اور ہم اس کو کیسے ٹھیک کریں۔''

شہزادے نے کہا:

''میں جن کے تین سنہری بال لانے جا رہا ہوں۔ ہو سکا تو تمہارے مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔''

شہر والوں نے شہزادے کو ایک خوب صورت سرخ ریشمی دوپٹہ تحفے میں دیا جس پر سونے چاندی کی تاروں سے کڑھائی بنی تھی۔ شہزادہ آگے چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک دریا کے کنارے پہنچا جہاں ایک ملاح اپنی کشتی میں بیٹھا تھا۔ شہزادہ دریا پار کرنے کے لیے اس کی کشتی میں بیٹھ گیا اور ملاح چپو چلانے لگا۔ جب دوسرے کنارے پر پہنچے تو ملاح نے کہا:

''لگتا ہے آپ کسی خاص سفر پر جا رہے ہیں۔ کیا آپ میرے ایک سوال کا جواب تلاش کر لائیں گے؟''

شہزادے نے کہا:

''ضرور کیا سوال ہے؟''

ملاح نے کہا:

''میں اس کشتی کا قیدی ہوں۔ اس سے نکل نہیں سکتا۔ دن رات اسی میں بیٹھے

رہنے پر مجبور ہوں۔ کیا کوئی ایسا طریقہ ہوسکتا ہے کہ میری اس سے جان چھوٹ جائے؟''

شہزادے نے جواب ڈھونڈنے کا وعدہ کیا۔ ملاح نے شہزادے کو سونے کی ایک انگوٹھی تحفے میں دی۔ شہزادہ کئی دن سفر کرتا رہا۔ آخر اُس پہاڑ تک جا پہنچا جہاں جن کا گھر تھا۔ پہاڑ پر چڑھ کر اس نے جن کے دروازے پر دستک دی۔ جن کی نانی نے دروازہ کھولا۔

شہزادے نے کہا:

''السلام علیکم نانی جان!''

بے چاری بوڑھی نانی سارا دن اکیلی رہتی تھی۔ شہزادے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بولی:

''ارے کتنے اچھے لڑکے ہو تم، کتنی تمیز سے سلام کرتے ہو، کہاں سے آئے ہو؟ کیا کام ہے؟''

شہزادے نے کہا:

''نانی جان! میں ایک شہزادہ ہوں۔ آپ کے پاس جو جن رہتا ہے اس کے سر میں سونے کے تین بال ہیں۔ میں وہ بال لینے آیا ہوں۔ اگر آپ وہ بال مجھے دے دیں تو میں آپ کو تین تحفے دوں گا۔''

نانی یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور بولی:

''آج تک کوئی میرے لیے تحفہ نہیں لایا۔ جلدی سے دکھاؤ کیا تحفے ہیں؟''

شہزادے نے کہا:

''ہر تحفے کے ساتھ ایک سوال بھی ہے جس کا جواب آپ کو دینا ہوگا۔''

نانی خوشی سے تالیاں بجا کر بولی:

''ارے واہ! یہ تو بہت مزے کا کھیل ہے۔ تحفے کے ساتھ سوال کا جواب۔ بتاؤ کیا سوال ہیں؟''

شہزادے نے کہا:

''پہلا سوال یہ ہے کہ ایک شہر میں ایک فوارہ ہے جس کا پانی شہد کی طرح میٹھا ہے۔ اس فوارے کا پانی بند کیوں ہوگیا ہے؟''

یہ کہہ کر اس نے ہیروں کا ہار نکال کر نانی کی خدمت میں پیش کیا۔ نانی خوشی سے اچھل پڑی۔ جلدی سے ہار لے کر گلے میں ڈال لیا اور کہنے لگی:

''اتنا خوب صورت ہار تو میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ بیٹا جلدی سے بتاؤ دوسرا سوال کیا ہے؟''

شہزادے نے دوسرا سوال بتایا:

''ایک شہر ہے، جہاں انار کے درخت پر میٹھے انار لگتے ہیں، وہ درخت کیوں سوکھتا جا رہا ہے؟''

یہ کہہ کر سرخ ریشمی دوپٹہ نکال کر نانی کے حوالے کیا۔ نانی نے جلدی سے دوپٹہ اوڑھ لیا اور خوشی سے بولی:

''ارے واہ کس قدر خوب صورت دوپٹہ ہے۔''

شہزادے نے تیسرا سوال پوچھا:

''وہ جو دریا میں ملاح ہے، وہ اپنی کشتی کی قید سے کیسے نکل سکتا ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے سونے کی انگوٹھی نانی کو دی۔ نانی نے انگوٹھی پہن لی اور بولی:

''ان تین سوالوں کے جواب میں تمہیں تین سنہری بالوں کے ساتھ دوں گی۔ اب تم جلدی سے چھپ جاؤ، جن کے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔''

نانی نے شہزادے کو ایک الماری میں چھپا دیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جن آ گیا۔

''آدم بُو..... آدم بُو۔'' اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔

''نانی یہاں تو مجھے کسی انسان کی بو آ رہی ہے۔''

نانی نے کہا:

''ارے یہ تو میں نے تمہارے لیے پراٹھے پکائے ہیں، یہ خوشبو ان پراٹھوں کی ہے۔ آ جلدی سے کھانا کھا لے۔''

جن نے ایک سو بیس پراٹھے کھائے اور بولا:

''واہ نانی! آج تو آپ نے بڑے مزے کا کھانا بنایا ہے۔ کھانا کھا کر اب نیند آنے لگی ہے۔''

نانی پیار سے بولی:

''آ جا میرا بچہ۔ یہاں میری گود میں سر رکھ کر سو جا۔''

جن نانی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نانی آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں جن کے خراٹے گونجنے لگے۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے پھیرتے نانی نے ایک سنہری بال تلاش کیا اور جھٹکے سے توڑ لیا۔ جن گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا نانی؟'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''بال کیوں کھینچ رہی ہو میرے؟''

نانی بولی:

''ارے معاف کرنا بیٹا! وہ دراصل میں کچھ سوچ رہی تھی۔ غلطی سے تمہارے بال کھینچ لیے۔''

جن جمائی لے کر بولا:

''کیا سوچ رہی تھی نانی؟''

''میں سوچ رہی تھی کہ دور وہ جو ایک شہر ہے جس میں ایک میٹھے پانی کا فوارہ ہے، وہ فوارہ کیوں بند ہوگیا ہے؟''

جن نے قہقہہ لگایا:

''ہاہاہا..... اس سوال کا جواب صرف مجھے معلوم ہے۔ اس فوارے کے سوراخوں میں مٹی پھنس گئی ہے۔ اگر وہ بے وقوف لوگ فوارے کو کھول کر صاف کر لیں تو پانی پھر سے چل پڑے گا۔''

نانی نے خوش ہو کر کہا:

''ارے! تم کتنے عقل مند ہو میرے بچے۔ چلو اب تم سو جاؤ۔ سو جاؤ میرے بچے۔''

جن دوبارہ نانی کی گود میں سر رکھ کر سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ نانی دوبارہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ انگلیاں پھیرتے پھیرتے اس نے دوسرا سنہری بال پکڑا اور جھٹکے سے توڑ لیا۔ جن اچھل پڑا۔

''نانی!'' اس نے غصے سے کہا:

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ پھر سے بال نوچ لیے میرے؟''

نانی بولی:

''معاف کرنا بیٹا! دراصل میں یہ سوچ رہی تھی کہ دور وہ جو ایک شہر ہے جس میں میٹھے اناروں کا درخت ہے، وہ درخت کیوں سوکھتا جا رہا ہے؟''

جن نے کہا:

''اس سوال کا جواب صرف مجھے معلوم ہے۔ اس درخت کی جڑوں میں ایک بہت موٹا چوہا بیٹھا جڑوں کو کتر رہا ہے۔ شہر والوں کو چاہیے کہ وہاں سے کھود کر اس چوہے کو مار ڈالیں۔ درخت پھر سے ہرا بھرا ہو جائے گا۔''

نانی خوش ہو کر بولی:

''واہ واہ! تم کتنے عقل مند ہو میرے بچے! چلو اب تم پھر سے سو جاؤ۔''

جن نے کہا:

''دیکھنا اب میرے بال نہ کھینچنا نانی ورنہ میں یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔''

نانی بولی:

''نہیں نہیں بیٹا! تم بے فکر ہو کر سو جاؤ..... سو جاؤ میرے بچے۔''

جن خراٹے لینے لگا۔ نانی نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تیسرا سونے کا بال تلاش کیا اور جھٹکے سے توڑ لیا۔ جن تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا کرتی ہو نانی!'' اس نے تڑپ کر پوچھا۔

نانی بولی:

''ارے! معاف کرنا بیٹا۔ دراصل میں سوچ رہی تھی کہ بڑے دریا میں جو ملاح کشتی چلاتا ہے، وہ اپنی کشتی سے اترتا کیوں نہیں؟''

جن بولا: ''کیا ہو گیا ہے نانی؟ آج ساری دنیا کے سوال آپ ہی کیوں سوچ رہی ہیں؟ وہ ملاح اصل میں ایک بادشاہ ہے جسے اس کے دشمن نے جادو کے زور سے ملاح بنا دیا تھا اور خود اس کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اگر یہ ملاح اپنا چپو کسی کو پکڑا دے تو وہ آزاد ہو جائے گا اور چپو پکڑنے والا کشتی میں قید ہو جائے گا۔''

نانی بولی:

''واہ واہ! بہت اچھی بات کی تم نے..... چلو اب تم سو جاؤ میرے بچے۔''

جن نے کہا:

''میری توبہ نانی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سوؤں گا۔ یہاں رہا تو آپ میرے سارے بال نوچ ڈالو گی۔''

جن چلا گیا تو نانی نے شہزادے کو الماری سے نکالا اور کہا:

''یہ رہے جن کے تین سنہری بال اور سوالوں کے جواب تو تم نے سن ہی لیے ہوں گے۔''

شہزادے نے نانی کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے وہ دریا پر پہنچا۔ ملاح نے پوچھا:

''میرے سوال کا جواب لائے؟'' شہزادے نے کہا:

''ہاں مگر دوسرے کنارے پر پہنچ کر بتاؤں گا۔'' ملاح نے اسے کشتی میں بٹھا کر دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ شہزادہ کشتی سے اتر کر کنارے پر کھڑا ہوا اور ملاح کو وہ جواب بتایا جو اس نے جن سے سنا تھا۔ ملاح نے پوچھا:

''یہ بات تم نے مجھے کشتی ہی میں کیوں نہ بتائی؟'' شہزادہ مسکرایا اور وہاں سے چلا گیا۔

شہزادہ کئی دن چلتا رہا۔ پھر وہ انار کے درخت والے شہر میں پہنچا۔ وہاں کے لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ شہزادے نے ایک بیلچہ منگوایا اور درخت کی جڑوں کو کھودنے لگا۔ وہاں واقعی ایک موٹا تازہ چوہا بیٹھا جڑیں کتر رہا تھا۔ شہزادے نے اسے مار ڈالا۔ درخت پھر سے ہرا بھرا ہو گیا۔ شہر کے لوگ خوشی سے جھوم اٹھے۔ انہوں نے ڈھیر سارے ہیرے جواہرات شہزادے کو تحفے میں دیے۔ شہزادہ اپنے سفر پر چل پڑا۔ کئی دن بعد وہ فوارے والے شہر میں پہنچا۔ لوگ بے چینی سے اس کی راہ تک رہے تھے۔ شہزادے نے فوارے کو کھول کر اس کے سوراخوں میں پھنسی مٹی صاف کر دی اور فوارہ پھر سے چل پڑا۔ لوگ بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے بہت سا مال و دولت شہزادے کو تحفے میں دیا۔

کئی دن کے سفر کے بعد شہزادہ بیمار بادشاہ کے پاس پہنچا اور جن کے تین سنہری بال اس کے حوالے کر دیے۔ جوں ہی وہ بال پیس کر بادشاہ کو کھلائے گئے۔ وہ اسی وقت صحت یاب ہو گیا۔ بادشاہ نے شہزادے کے پاس اتنا مال و دولت دیکھا تو اس کے دل میں لالچ

بقیہ صفحہ نمبر: 29

جادوئی ہاتھ

مہوش اسد شیخ

میں بستر میں بیٹھا سائنس فکشن کہانیوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ آج فضا میں خنکی معمول سے خاصی زیادہ تھی۔ جلد ہی میں نے اکتا کر کتاب بند کر دی، لکھنے والے بھی جانے کیا کیا لکھ ڈالتے ہیں، بھلا جو جو لکھا ہے وہ حقیقت کہاں ہو سکتا ہے؟

محض فرضی باتیں، دل لبھانے کے طریقے.....

''میں جو کہ حقیقت میں جینا پسند کرتا ہوں، فرضی قصے کہانیوں سے جلد ہی اکتا جاتا ہوں اور سائنس فکشن تو ویسے ہی میرے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے، مگر پھر بھی پڑھتا ہوں کیونکہ چاہے کچھ دیر کو ہی سہی مگر انسان کو اک نئے جہاں کی سیر کروا دی جاتی ہے۔ میں نے کتاب میز پہ ڈالی اور بستر میں دبک گیا۔

''اف لائٹ آف نہیں کی۔'' اچانک مجھے خیال آیا۔

''کاش میرے ہاتھ جادوئی ہوتے، لیٹے لیٹے ہی ہاتھ لمبے کر کے لائٹ بند کر سکتا۔''

یہ خواہش میں بچپن ہی سے کرتا آیا ہوں۔ ہمیشہ ہی لائٹ بند کرنا بھول جاتا یا بستر میں گھستے ہی پیاس ستانے لگتی۔ جادوئی ہاتھوں کی خواہش اور ضرورت مجھے بچپن ہی سے رہی ہے، مگر آہ!'' ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔''

☆

نام تو اس کا بدر زمان تھا، مگر کیونکہ وہ ایک نو آموز سائنس دان تھا، نت نئے تجربے کرنا اس کا جنون تھا۔ چند ایک تجربے کامیاب بھی رہے تھے جیسا کہ اس نے حال میں ہی گدلے پانی کو صاف کرنے کی مشین ایجاد کی تھی جو کہ موجودہ حالات کے پیش نظر اک شاندار اور کامیاب تجربہ تھا۔ جب کے پانی کا ذخیرہ کرہ ارض سے تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ آئن سٹائن کے لقب سے پکارنے کی بجائے میں از راہِ شرارت اسے بونگسٹائن کہا کرتا۔ وہ میرا جگری دوست تھا، میرے مذاق کو سمجھتا تھا سو کبھی برا نہیں منایا۔ کبھی جوابی کارروائی بھی نہیں کی، ہر بار مسکرانے پہ اکتفا کرتا۔ لیکن ایک بات تھی کہ رفتہ رفتہ میں اس کی قابلیت کا معترف ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے جب بھی ملاقات کی طلب ہوتی میں اس کی سائنس لیبارٹری چلا جاتا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ وہیں ملے گا۔ ایک دن یوں ہی بیٹھے بٹھائے ملنے کو دل چاہا تو میں اس کی لیبارٹری چلا گیا۔

''آہا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

مجھے دیکھتے ہی وہ گرمجوشی سے آگے بڑھا۔

''کیوں کوئی نیا زہر تیار کر لیا ہے کیا؟ خبردار جو مجھ پہ آزمانے کی کوشش کی۔'' میں نے بھنویں سکیڑتے ہوئے مزاقاً تنبیہی انداز میں کہا تو وہ کھلکھلایا۔

''نہیں زہر ایجاد نہیں کیا، زہر بنانے والے اور بہت ہیں۔ ہاں البتہ میرے پاس ایک تحفہ ہے تمہارے لیے۔ یاد ہے تم اکثر کہا کرتے ہو کہ کاش! تمہارے ہاتھ جادوئی ہوتے، تم ایک جگہ بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو دور دور تک کام کرنے کے لیے بھیج سکتے۔ تمہیں خود نہ جانا پڑے۔''

''یہ خواہش اس وقت زور پکڑتی ہے جب میں بستر میں جا چکا ہوتا ہوں۔''

میں نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''اب تمہیں مزید کڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ دیکھو۔''

اس نے آہنی دستانے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

میری پیشانی پہ بل پڑنے لگے۔

''یہ جادوئی ہاتھ ہیں، دستانوں کی طرح پہن لو۔ پہنو تو سہی۔''

میری ہچکچاہٹ دیکھتے ہوئے اس نے پہننے کے لیے اصرار کیا۔

''نہ بابا نہ پتا چلے کہ پہنتے ہی میں بجلی کے جھٹکوں کی زد میں آ گیا ہوں اور چند ہی لمحوں میں اس جہاں سے اس جہاں منتقل ہو جاؤں۔''

میں نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے صاف انکار کیا۔

''تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں؟''

بونگلفائن نے کچھ اس ادا سے پوچھا کہ میں موم ہو گیا۔ اس کی دوستی پہ تو میری جان بھی قربان۔ میں نے خاموشی سے اپنے ہاتھ اس کے سامنے کر دیے گویا اعلان کیا کہ جو چاہو سلوک کرو میرے ساتھ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے آہنی دستانے میرے ہاتھوں پہ چڑھا دیے۔ ''تم سب سے پہلے کیا کرنا چاہو گے؟''

اس نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ''تمہاری پٹائی۔''

میں نے شرارتاً کہا۔ الفاظ میرے لبوں سے نکلے ہی تھے کہ میرے آہنی ہاتھ آگے بڑھے اور بونگلفائن کی مرمت کرنے لگے۔

''اوہ! بچاؤ، بچاؤ، روکو انہیں۔''

وہ دوران مرمت چلانے لگا۔ پہلے تو میں بوکھلا گیا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے روکا جائے ان جادوئی ہاتھوں کو۔

''بس..... بس..... بہت ہو گیا، واپس آ جاؤ۔''

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ہاتھ واقعی واپس لوٹ آئے۔

''واہ بھئی واہ! میری نیکی کا بہت خوب صلہ دیا۔''

وہ خفگی سے کہتا کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''سوری یار! میں نے تو مذاق کیا مجھے کیا پتا تھا کہ یہ ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آ جائیں گے۔'' میں واقعی شرمندہ تھا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ اسی بہانے تجھے ان ہاتھوں کی قابلیت کا اندازہ ہو گیا۔''

وہ خندہ پیشانی سے مسکرا دیا۔ میں ستائشی نگاہوں سے کبھی اسے دیکھتا اور کبھی ان آہنی دستانوں کو۔

.....☆.....

ایک دن دوپہر کو یکدم مجھے نیند نے گھیر لیا، میں جو ٹی وی پر ڈراما دیکھ رہا تھا ریموٹ سے ٹی وی بند کیا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اچانک حلق خشک ہو گیا، مجھے پانی کی طلب ہونے لگی۔ پہلے تو میں بے سدھ پڑا رہا مگر جب یاد آیا کہ اب تو میرے پاس جادوئی ہاتھ ہیں۔ میں یہاں لیٹے لیٹے پانی منگوا سکتا ہوں۔ میں دل ہی دل میں اپنے دوست کا شکریہ ادا کرتا اٹھ بیٹھا، دراز سے دستانے نکال کر اپنے ہاتھوں میں پہنے اور انہیں پانی لانے کا حکم صادر کر دیا۔

''ٹھہرو! ایسا کرنا آتے ہوئے فریج سے کوئی پھل وغیرہ بھی لیتے آنا۔''

میں نے لگے ہاتھوں دوسرا کام بھی کہہ ڈالا۔ جادوئی ہاتھ پھرتی سے کچن کی جانب بڑھ گئے۔

''پانی پلا دو مجھے کوئی۔''

ابا جی کی آواز کانوں میں پڑی تو ہاتھوں کو حکم دیا کہ پہلے ابا جی کو پانی پلائیں پھر میری طرف آئیں۔ ہاتھوں نے حکم کی تکمیل میں ابا جی کے کمرے کا رخ کیا۔ ابا جی جو کہ ان ہاتھوں کی بابت پہلے سے ہی جانتے تھے نے شکریہ کے ساتھ پانی لے لیا۔ اسی اثنا میں اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ ابا جی نے ہاتھوں کو باہر دیکھنے کا کہہ ڈالا۔ ہاتھ چاروناچار کھڑکی کے راستے ہی باہر نکل گئے۔ دروازہ کھولا تو سامنے دو تین بچے کھڑے تھے جو اپنی گیند لینے آئے تھے۔ گیند ان کے حوالے کی تو ہاتھوں کا دل کیا کہ وہ بھی کرکٹ کھیلیں۔ بس پھر دل کے آگے کس کی چلتی ہے۔ وہ بھی میرا حکم بھول کر کرکٹ کھیلنے لگے۔ محلے کے بچے بھی جادوئی ہاتھوں کے ساتھ بے خوف ہو کر کھیلنے لگے۔ میں کمرے میں بھوک اور پیاس سے نڈھال، انتظار کر رہا تھا۔ ایک دو بار آواز بھی دی مگر جواب ندارد۔ جب برداشت جواب دے گئی تو اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔ ہاتھوں کے تعاقب میں کچن کا رخ کیا وہاں سنک کا نل کھلا تھا پانی مسلسل بہہ رہا تھا، فریج کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ جادوئی ہاتھوں پر غصہ آیا کہ یہ کیا حرکت ہے، ایک کام ادھورا چھوڑ کر آگے کو بڑھ جانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ پھر خیال آیا کہ جب ابا جی نے پانی مانگا تو میرے حکم پر وہ آگے بڑھ گئے، سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر۔

''غلطی میری ہے وہ تو ایک مشین ہے اسے کیا عقل سمجھ۔''

میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ابا جی کے کمرے کی جانب بڑھا۔

''ابا جی میرے ہاتھ کہاں ہیں؟''

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی استفسار کیا۔

''پتر وہ تو اس کھڑکی سے باہر نکل گئے تھے، ابھی تک لوٹے نہیں، جانے دروازے پر کون ہے؟''

ابا جی سادہ سے انداز میں کہہ کر ایک بار پھر کتاب پڑھنے میں مگن ہو چکے تھے۔ میں نے بے چارگی سے کھڑکی کی طرف دیکھا، میں تو یہاں سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے دروازے سے جانا پڑا۔ مرکزی دروازے تک پہنچا، اطراف میں نگاہ دوڑائی، ہاتھ کہیں بھی دکھائی نہ دیئے۔ دروازہ کھول کر سامنے دیکھا تو جناب ہاتھ صاحبان گلی میں بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔

بقیہ صفحہ نمبر: 39

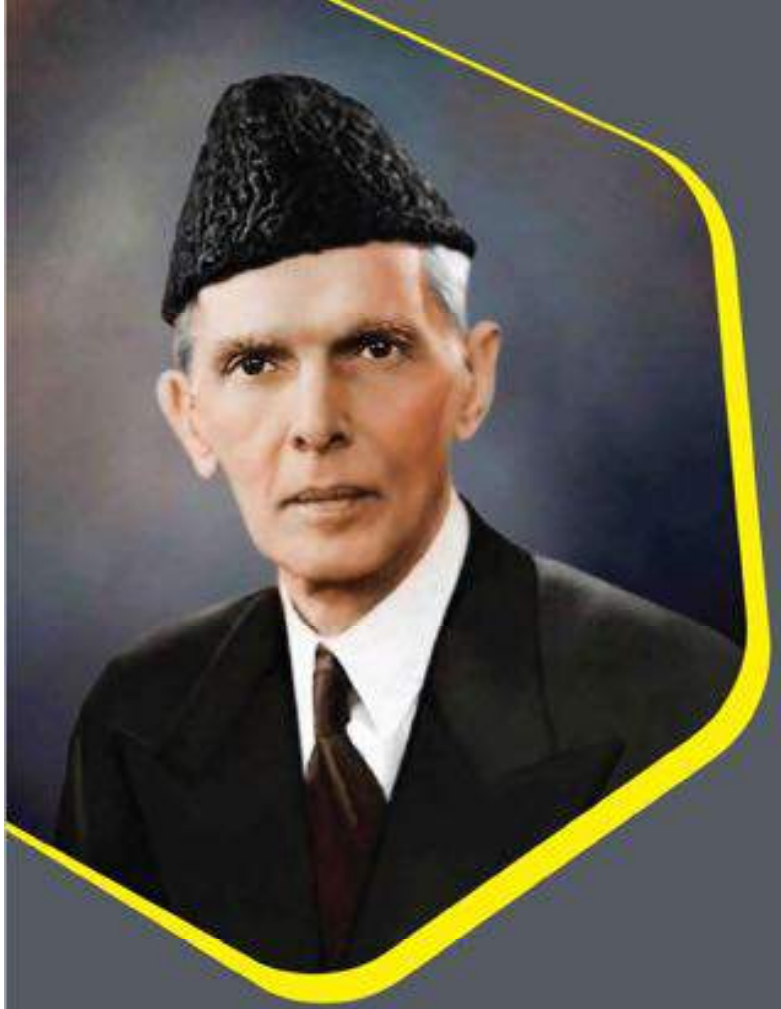

مِلت کا پاسباں

ماورا فاروق

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جس ملت کا پاسبان محمد علی جناح ہو وہ ملت کیسے ہار سکتی ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک کاروباری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ایک بیرسٹر، سیاستدان اور عظیم انسان تھے۔ آپ نے اپنی سیاست کا آغاز کانگرس میں شمولیت سے کیا۔ آپ 1913ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے محمد علی جناح نام ہے ایمان کا، تنظیم کا، اصول پسندی کا، حقیقت کا، دیانت کا، شفقت کا۔ قائداعظم کے بارے میں سٹینلے وابرٹ Stanley Walpert نے کیا خوب کہا ہے۔

''کچھ لوگ ہی ہیں جو تاریخ کو بدل سکتے ہیں اور کچھ ہی لوگ ہیں جو دنیا کے نقشے کو بدل سکتے ہیں اور مشکل سے ہی کوئی نئی ریاست وجود میں لا سکتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے یہ تینوں کام کر دکھائے۔''

1920ء میں قائداعظم نے کانگرس کو خیر باد کہہ دیا۔ 1940ء میں لاہور میں الگ وطن کا مطالبہ پیش کیا۔ محمد علی جناح ہندو مسلم اتحاد کے مخالف نہ تھے مگر آپ کا اس بات پر مکمل یقین تھا ہندوستان کے مسائل کا حل سوائے تقسیم ہند کے اور کوئی ہے ہی نہیں۔ مسلمانوں کے حقوق صرف ایک الگ ریاست میں ہی مضمر ہیں اور وہ آخر کار برطانوی حکومت کو باور کرانے میں کامیاب ہوئے۔ پاکستان کا وجود دنیا کے نقشے پر 14 اگست 1947ء کو وجود میں آیا۔ تقسیم ہند کے دوران بے تحاشہ خون بہایا گیا۔ قتل و غارت گری اور خون کی ہولی کے بعد ہندوستان دو الگ ریاستوں میں معرض وجود میں آیا پاکستانی ہونے کے ناطے ہمیں قائداعظم کے ان تمام پیغامات اور ہدایات پر مکمل عمل کرنا ہوگا تاکہ قائد اور ہمارے اسلاف نے جس مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا اس کا مقصد پورا ہو سکے۔

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے ہر پاکستانی کو ایمان، اتحاد اور تنظیم پر عمل کرنے کے لیے کہا۔

طلباء اور نوجوانوں کے لیے قائداعظم نے خصوصی پیغامات دیے۔

''تعلیم ہماری قوم کے لیے بہت ضروری ہے۔ دنیا بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے اگر آپ نے تعلیم حاصل نہ کی تو آپ مکمل طور پر پیچھے رہ جائیں گے۔ اور ختم ہو جائیں گے۔''

''دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں جو پاکستان کے وجود کو ختم کر سکے۔''

''دنیا میں آپ ایک ہی صورت میں ترقی کر سکتے ہیں اگر آپ صرف اتحاد، ایمان اور تنظیم سے سب کچھ حاصل کریں۔

''اگر آپ پاکستان کو عظیم الشان دیکھنا چاہیے ہیں تو آپ آرام و آسائش کو بھول جائیں اور کام پر توجہ دیں۔

قائداعظم نے نوجوانوں کو مستقبل کا سرمایہ تصور کیا ہے اور ان کو علم کے حصول پر خصوصی توجہ دینے کو کہا۔ خاص طور پر طلباء جو کے آنے والے کل کے معمار ہیں۔ ان کو مکمل طور پر اپنی محنت سے اپنے آپ کو منوانا ہے تاکہ آنے والے وقت کی مشکلات کا سامنا کر سکیں اور دنیا میں پاکستان کا نام بلند ہو۔ قائداعظم نے طلبا اور نوجوان نسل کو بار بار تعلیم پر زور دینے کو کہا تھا کہ اندرونی اور بیرونی مشکلات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

ہر پاکستانی طلباء، طلباء نوجوان قائداعظم کے فرمودات پر اس طرح عمل کر سکتا ہے کہ ہم اپنی اپنی جگہ پر دیانت سے ایمانداری سے لگن سے علم حاصل کریں اپنے فرائض کو بھرپور طریقے سے ادا کریں اور پاکستان کی ترقی میں اپنے حصے کی شمع جلا سکیں۔ کیونکہ جس ملّت کا پاسباں محمد علی جناح ہوں وہ ملّت کبھی خسارے میں نہیں رہ سکتی۔

☆.....☆.....☆

قبرستان کا بھوت

فائزہ تسنیم

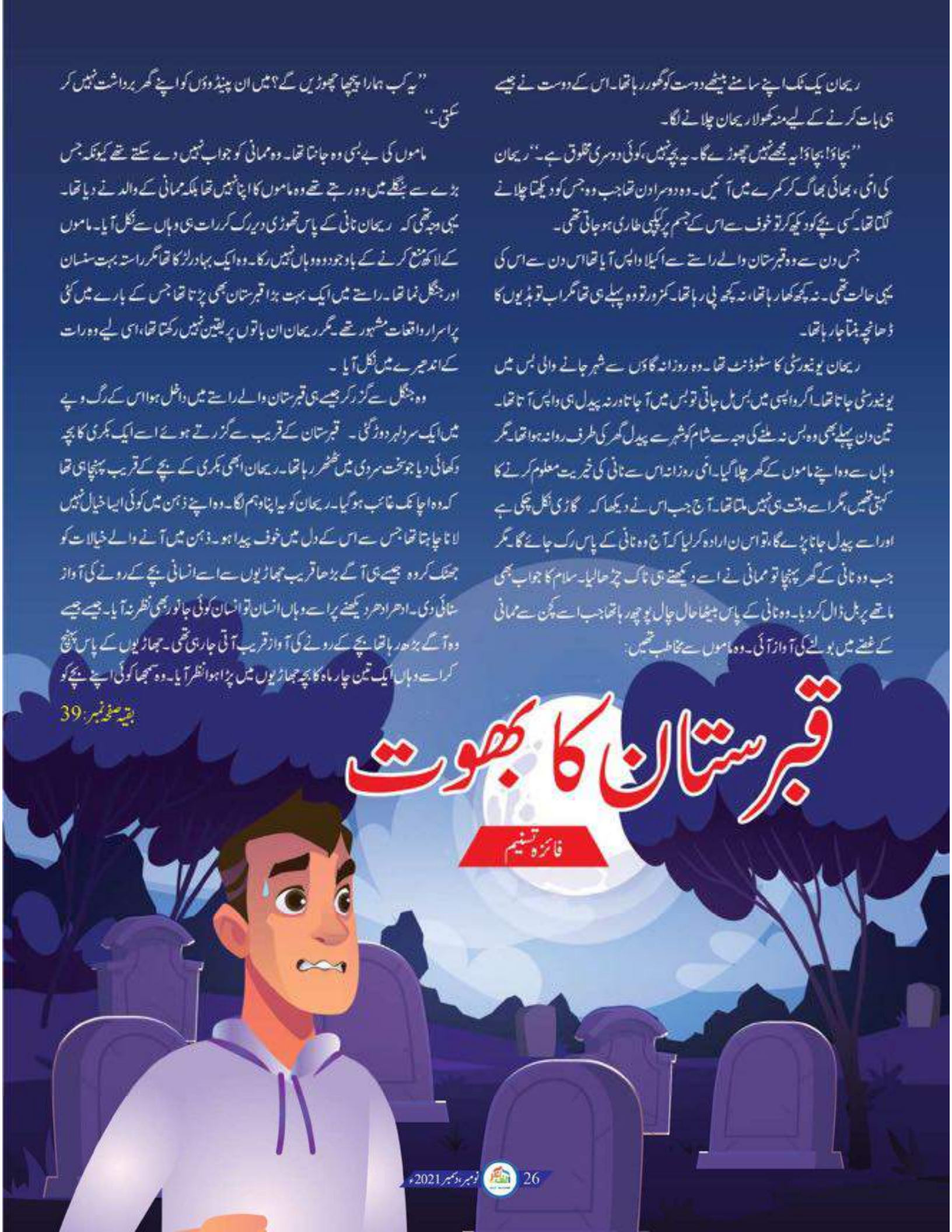

ریحان یک ٹک اپنے سامنے بیٹھے دوست کو گھور رہا تھا۔ اس کے دوست نے جیسے ہی بات کرنے کے لیے منہ کھولا ریحان چلانے لگا۔

''بچاؤ! بچاؤ! یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ یہ بچہ نہیں، کوئی دوسری مخلوق ہے۔'' ریحان کی امّی، بھائی بھاگ کر کمرے میں آئیں۔ وہ دوسرا دن تھا جب وہ جس کو دیکھتا چلانے لگتا تھا۔ کسی بچے کو دیکھ کر تو خوف سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

جس دن سے وہ قبرستان والے راستے سے اکیلا واپس آیا تھا اس دن سے اس کی یہی حالت تھی۔ نہ کچھ کھا رہا تھا، نہ کچھ پی رہا تھا۔ کمزور تو وہ پہلے ہی تھا مگر اب تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔

ریحان یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ تھا۔ وہ روزانہ گاؤں سے شہر جانے والی بس میں یونیورسٹی جاتا تھا۔ اگر واپسی میں بس مل جاتی تو بس میں آ جاتا ورنہ پیدل ہی واپس آتا تھا۔ تین دن پہلے بھی وہ بس نہ ملنے کی وجہ سے شام کو شہر سے پیدل گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ مگر وہاں سے وہ اپنے ماموں کے گھر چلا گیا۔ امّی روزانہ اس سے نانی کی خیریت معلوم کرنے کا کہتی تھیں، مگر اسے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ آج جب اس نے دیکھا کہ گاڑی نکل چکی ہے اور اسے پیدل جانا پڑے گا، تو اس نے ارادہ کر لیا کہ آج وہ نانی کے پاس رک جائے گا۔ مگر جب وہ نانی کے گھر پہنچا تو ممانی نے اسے دیکھتے ہی ناک چڑھا لیا۔ سلام کا جواب بھی ماتھے پر بل ڈال کر دیا۔ وہ نانی کے پاس بیٹھا حال چال پوچھ رہا تھا جب اسے کچن سے ممانی کے غصّے میں بولنے کی آواز آئی۔ وہ ماموں سے مخاطب تھیں:

''یہ کب ہمارا پیچھا چھوڑیں گے؟ میں ان پینڈوؤں کو اپنے گھر برداشت نہیں کر سکتی۔''

ماموں کی بے بسی وہ جانتا تھا۔ وہ ممانی کو جواب نہیں دے سکتے تھے کیونکہ جس بڑے سے بنگلے میں وہ رہتے تھے وہ ماموں کا اپنا نہیں تھا بلکہ ممانی کے والد نے دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ریحان نانی کے پاس تھوڑی دیر رک کر رات ہی وہاں سے نکل آیا۔ ماموں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ وہاں نہیں رکا۔ وہ ایک بہادر لڑکا تھا مگر راستہ بہت سنسان اور جنگل نما تھا۔ راستے میں ایک بہت بڑا قبرستان بھی پڑتا تھا جس کے بارے میں کئی پراسرار واقعات مشہور تھے۔ مگر ریحان ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا، اسی لیے وہ رات کے اندھیرے میں نکل آیا۔

وہ جنگل سے گزر کر جیسے ہی قبرستان والے راستے میں داخل ہوا اس کے رگ و پے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک بکری کا بچہ دکھائی دیا جو سخت سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ ریحان ابھی بکری کے بچے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ وہ اچانک غائب ہو گیا۔ ریحان کو یہ اپنا وہم لگا۔ وہ اپنے ذہن میں کوئی ایسا خیال نہیں لانا چاہتا تھا جس سے اس کے دل میں خوف پیدا ہو۔ ذہن میں آنے والے خیالات کو جھٹک کر وہ جیسے ہی آگے بڑھا قریب جھاڑیوں سے اسے انسانی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ادھر ادھر دیکھنے پر اسے وہاں انسان تو انسان کوئی جانور بھی نظر نہ آیا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا بچے کے رونے کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ جھاڑیوں کے پاس پہنچ کر اسے وہاں ایک تین چار ماہ کا بچہ جھاڑیوں میں پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ سمجھا کوئی اپنے بچے کو

بقیہ صفحہ نمبر: 39

میں رنگ ہوں!

قرۃ العین خرم ہاشمی

''مس! آج ہم نے ہوم ورک جلدی ختم کرلیا ہے۔ کیا ہم تھوڑی دیر کھیل لیں؟''

تیرہ سالہ حمزہ نے اپنی ٹیوشن ٹیچر مس ارم سے کہا۔ مس ارم نے ہدیٰ کی کاپی چیک کرتے ہوئے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ حمزہ اور علی بیٹ بال ہاتھ میں پکڑے، پرجوش نظر آرہے تھے۔ مس ارم نے گھڑی میں وقت دیکھا تو بچوں کی چھٹی ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے، مگر چھے بجے کھیل ختم کرکے گھر کی راہ لینا۔''

مس ارم نے تنبیہ کی تو دونوں نے فوراً سر ہلا دیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ مس ارم کے گھر کا باغ بہت بڑا تھا۔ جہاں کھیلنے کا شوق ٹیوشن کے لیے آنے والے سب بچوں کو تھا۔ حمزہ اور علی کے ساتھ کچھ اور بچے بھی بیٹ بال کھیلنے باغ میں چلے گئے۔

''مس! میں بھی کرکٹ کھیلوں گی۔'' حمزہ اور علی سے دو سال چھوٹی ہدیٰ نے جلدی سے کہا۔

''ہاں ضرور! لڑکیاں بھی کرکٹ کھیل سکتی ہیں۔''

مس ارم نے کہا تو گیارہ سالہ ہدیٰ خوشی سے اپنی کاپی بیگ میں رکھ کر باہر بھاگ گئی۔ کچھ دیر کے بعد روتی ہوئی ہدیٰ واپس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''ہدیٰ! کیا ہوا؟ کسی نے مارا ہے؟''

مس ارم نے فکرمندی سے پوچھا مگر ہدیٰ مسلسل رو رہی تھی۔ مس ارم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر لے گئیں جہاں سب لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ مس ارم اور ہدیٰ کو آتے دیکھ کر سب رک گئے۔ ہدیٰ کے پیچھے پیچھے کچھ اور لڑکیاں بھی باہر آگئیں تھیں۔

''ہدیٰ کو کس نے کچھ کہا ہے؟'' مس ارم نے سخت لہجے میں پوچھا تو حمزہ نے علی کی طرف دیکھا۔

''مس! ہم نے کچھ نہیں کہا۔ حمزہ اور علی نے اپنی بہن کو ڈانٹا ہے۔'' ایک بچے نے جلدی سے کہا تو مس ارم نے حمزہ اور علی کو گھورا۔

''مس! ہدیٰ ہمیشہ ہم سے ہر معاملے میں ضد کرتی ہے۔ اس کو سب کام ہمارے والے کرنے ہوتے ہیں۔'' حمزہ نے منہ بنا کر کہا۔

''مس! حمزہ اور علی بھائی مجھے کرکٹ کھیلنے نہیں دیتے ہیں بلکہ ہمیشہ ہر چیز میں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔'' ہدیٰ نے غصے سے کہا۔

''کیوں؟'' مس ارم نے حیرانی سے سوال کیا۔

''مس! یہ مجھے لڑکی کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں۔'' دس سالہ ہدیٰ نے منہ بسور کر کہا تو مس ارم بے ساختہ مسکرا دیں۔

''ہدیٰ! لڑکی تو آپ ہیں ناں۔'' مس ارم نے نرمی سے کہا۔

''مگر مس! حمزہ اور علی بھائی مجھے گھر میں بھی کسی کھیل میں شامل نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ میں لڑکی ہوں اس لئے لڑکوں والے کھیل نہیں کھیل سکتی۔''

ہدیٰ نے جلدی سے بتایا تو مس ارم نے سوالیہ انداز میں حمزہ اور علی کی طرف دیکھا۔

''مس اس میں غلط کیا ہے؟ لڑکیاں لڑکیوں والے کھیل کھیلا کریں۔'' علی نے منہ بنا کر کہا۔

''لڑکو! یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ کیا لڑکیوں کی کرکٹ ٹیم نہیں ہے؟ یا لڑکیاں ہاکی نہیں کھیل رہیں؟ ریسلنگ، باکسنگ، ہائیکنگ، سائیکلنگ وغیرہ ہر چیز میں لڑکیاں برابر حصہ لیتی ہیں۔ اب تو ایسا کوئی کھیل نہیں جس میں لڑکیاں حصہ نہ لے رہی ہوں۔ اس لئے جب آپ سب کھیلیں تو ساتھ اپنی بہنوں کو بھی شامل کر لیا کریں۔'' مس ارم نے سنجیدگی سے سمجھایا تو حمزہ نے فوراً سر ہلا دیا۔

''مس! آئندہ ایسا ہی کروں گا۔'' حمزہ نے جلدی سے کہا تو مس ارم گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ حمزہ نے انھیں ٹالنے کے لئے حامی بھری تھی۔ کچھ دن کے بعد ہدیٰ ٹیوشن پڑھنے آئی تو بہت اداس تھی۔ مس ارم نے فارغ وقت میں اس کی اداسی کی وجہ پوچھی۔

''مس! میں لڑکی کیوں ہوں؟ اللہ میاں نے مجھے لڑکا کیوں نہیں بنایا؟'' ہدیٰ نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''اس لئے کہ لڑکیاں رحمت ہوتی ہیں اور آپ کو اللہ میاں نے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' مس ارم نے نرم لہجے میں سمجھایا۔

''پھر میں ان سے پیچھے کیوں ہوں؟'' ہدیٰ نے اداسی سے سوال کیا۔

''یہ صرف تمہاری سوچ ہے۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ دماغ کے بروقت استعمال اور ذہانت سے تم بڑے بڑے، بہادر اور طاقتور انسانوں کو شکست دے سکتی ہو۔ اپنے ہنر، اپنی قابلیت کو پہچانو۔'' مس ارم نے نرم لہجے میں سمجھایا تو غور سے سنتی ہدیٰ نے سر ہلایا تھا۔

دراصل ہدیٰ جڑواں بھائیوں حمزہ اور علی کی چھوٹی بہن تھی۔ علی اور حمزہ کی پسند، کھیل وغیرہ سب ایک جیسے تھے جبکہ ہدیٰ ان دونوں کو کاپی کرنے کی کوشش کرتی مگر اکثر اس وجہ سے ان سے لڑ بھی پڑتی تھی۔ ہدیٰ زیادہ تر لڑکوں والے کام کرتی۔

وہ اپنی اصل شخصیت کے برعکس زندگی گزارنا چاہتی تھی، جو اس کے لئے پریشانی اور مشکل کا باعث بن جاتا۔ ہدیٰ کو لڑکی ہونے کا احساس بار بار حمزہ اور علی دلاتے تھے کہ وہ ان سے کمزور اور ہر چیز میں پیچھے ہے۔ ہدیٰ کو اس بات پر بہت غصہ آتا تھا۔ ان تینوں کی لڑائی اور بحث سے ان کے والدین بھی تنگ آ جاتے۔ وہ تینوں کو سمجھاتے مگر تینوں ضد میں آ کر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد سکول میں اقبال ڈے پہ مختلف مقابلوں کا اعلان ہوا تو سب بچے بہت پرجوش ہو گئے۔ ہر کلاس میں سے کچھ نمائندہ بچوں کو چنا گیا۔ اس بچے کی جیت کلاس کی جیت ہونی تھی۔ اس کے لئے ایک الگ سے ٹرافی کا بندوبست کیا گیا۔

ایک مقابلے میں سب بچوں نے اقبال ڈے کی مناسبت سے خوبصورت تصویریں اور پوسٹر بنا کر لے جانے تھے۔

ہدیٰ کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔ اس لئے مس ارم کے مشورے سے اس نے تصویر بنانا شروع کی۔ حمزہ اور علی بھی بہت پرجوش تھے۔

انھوں نے بڑے سے چارٹ پر ایک تصویر بنائی مگر ان دونوں کی ڈرائنگ اتنی اچھی نہیں تھی اور نہ دونوں صفائی سے رنگ بھرنا جانتے تھے جبکہ ہدیٰ کی ڈرائنگ اور رنگ بھرنے کی صلاحیت ہمیشہ سے بہترین تھی۔

ایک دن ہدیٰ اپنی بنائی ڈرائنگ مس ارم کو دکھا رہی تھی جب حسب معمول دونوں بھائی مل کر بہن کا مذاق اڑانے لگے۔

''مس! ہم تو اقبال کے شاہین ہیں۔ یہ کیا ہے؟ نازک سی چڑیا۔''

حمزہ نے ہدیٰ کو چڑاتے ہوئے کہا۔ ہدیٰ نے منہ بسورتے ہوئے مس ارم کی طرف دیکھا۔

''شرارتی لڑکو! اس کا جواب اقبال ڈے پر ملے گا۔''

مس ارم نے ہدیٰ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔ دونوں نے اقبال ڈے سے پہلے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ہدیٰ کی بنائی ڈرائنگ کی ایک جھلک ہی دیکھ لیں مگر ہدیٰ اپنی ڈرائنگ کا سارا کام مس ارم کے گھر کرتی تھی اور وہاں ہی چھوڑ کر آتی تاکہ دونوں اس کی بنائی ڈرائنگ دیکھ نہ سکیں۔

کچھ دن کے بعد اقبال ڈے تھا جس میں مس ارم بھی ان کے سکول گئیں۔ ہدیٰ کی بنائی ڈرائنگ چارٹ، وہ اپنے ساتھ لائیں تھیں۔ فنکشن شروع ہونے سے پہلے ہدیٰ نے مسکراتے ہوئے ان سے ڈرائنگ چارٹ پکڑا تھا۔

حمزہ اور علی کی کلاس کی باری آئی تو ان دونوں نے بڑے چارٹ پر اپنی بنائی تصویر پیش کی جس میں ایک چٹان بنی ہوئی تھی اور اس پر پر پھیلائے بیٹھا ہوا شاہین بنا تھا۔ کونے میں علامہ اقبال کے چند اشعار لکھے ہوئے تھے۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تُو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ہدیٰ کی کلاس کی باری آئی تو ہدیٰ پُراعتماد انداز میں اسٹیج پر آئی اور اپنی بنائی ڈرائنگ

کا رخ ہال کی طرف کرتے ہوئے کہنے لگی:

''میں اس کائنات کا سب سے پیارا رنگ ہوں۔ ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال نے فرمایا ہے کہ:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے، زندگی کا سوز دروں

ہدیٰ نے سفید بیک گراونڈ پر، اڑتی ہوئی، چھوٹی رنگ برنگی بہت ساری تتلیاں بنائی تھیں، جو جہاں سے گزرتی، رنگ چھوڑ گئی تھیں۔

ہدیٰ کی بنائی تصویر اور تخیل کی پرواز دیکھ کر سب نے بہت داد دی۔ ہدیٰ کے لئے خاص طور پر تالیاں بجائی گئیں۔ حمزہ اور علی حیرانی سے سب دیکھ رہے تھے۔

ہر کوئی ہدیٰ کی تعریف کر رہا تھا۔ ہدیٰ کی وجہ سے ان کی کلاس تصویری مقابلے میں جیت گئی تھی۔ پہلا انعام ہدیٰ کو ملا تھا۔

''دیکھا اقبال کے شاہینو! کائنات میں، جس آسمان پر شاہین پرواز کرتا ہے، ان کے سب رنگ وجودِ زن کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔''

گھر واپس جاتے ہوئے مس ارم نے مسکرا کر حمزہ اور علی کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں نے حسرت بھری نگاہ سے پُر اعتماد انداز میں ٹرافی اٹھا کر چلتی، خود سے دو سال چھوٹی مگر پرعزم اور ہنرمند بہن کی طرف دیکھا تھا جو اپنی صلاحیت اور قابلیت کے بل بوتے پر، اپنے سے بڑے حریف کو بہت آسانی سے شکست دے سکتی تھی۔

علامہ محمد اقبال کی نگاہِ دُوررس نے اس راز کو صدیوں پہلے ہی جان لیا تھا۔ آج علامہ محمد اقبال کی شاعری کی وجہ سے ہی ہدیٰ کو اپنی پہچان، خودی اور بلندی کا راستہ ملا تھا۔ جس کے لئے وہ مس ارم کی بھی شکر گزار تھی کیونکہ وہ بھی ہدیٰ کی طرح، اس وسیع کائنات کا ایک مکمل اور خوبصورت رنگ تھی۔ ☆

بقیہ: جن کے تین سنہری بال

آ گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید شہزادہ یہ مال و دولت جن سے لے کر آیا ہے۔ اس نے اسی وقت سفر کی تیاری کی اور جن کے گھر جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ کئی دن چلتے رہنے کے بعد آخر وہ اس دریا پر پہنچا جہاں ملاح اپنی کشتی میں بیٹھا تھا۔

دریا پار کرنے کے لیے بادشاہ کشتی میں بیٹھا تو ملاح نے کہا:

''بھائی! ذرا یہ چپو تو پکڑنا۔'' بادشاہ نے بے خیالی میں چپو پکڑ لیا۔ ملاح اسی وقت کشتی سے اتر کر دریا کے کنارے کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے غصے سے کہا:

''کہاں جا رہے ہو ملاح؟ مجھے دریا پار کرواؤ۔''

ملاح نے ہنس کر کہا:

''اے دوست! ملاح اب میں نہیں تم ہو۔ مجھے غور سے دیکھو۔ میں وہی بادشاہ ہوں جسے تم نے جادو کے زور سے اسی کشتی میں قید کر دیا تھا اور خود میری جگہ بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ اب تم اس کشتی کے قیدی ہو۔ میں اپنا تخت و تاج لینے واپس جا رہا ہوں۔''

یوں اس ظالم شخص نے اپنے کیے کا پھل پایا اور تمام زندگی ملاح بن کر کشتی چلاتا رہا۔

☆.....☆.....☆

بقیہ: کرسمس کیک

''تو مشکل کیا ہے اس میں؟ رنگیلا خرگوش تم لوگوں کی مدد کر سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' چاروں چلائے۔

''خرگوش کچی مٹی میں سرنگ بنا لیتا ہے۔ وہ یہاں باہر سے مٹی میں سرنگ بناتا پچھلے لان تک چلا جائے گا اور چابیاں لے کر باہر آ جائے گا۔ میں اب چلتی ہوں دعوت میں ملتے ہیں'' خالہ بلّی مُسکراتے ہوئے مسئلہ حل کر کے چلتی بنی۔ چاروں بونے بھاگم بھاگ رنگیلے خرگوش کے گھر پہنچے رنگیلا خرگوش اپنے رنگین گھر میں بیٹھا مزے سے لال، لال گاجریں کھا رہا تھا۔ بونوں کی۔ پوری بات سُن کر بولا:

''میں تم لوگوں کی مدد کے لیے تیار ہوں، لیکن میری ایک شرط ہے۔''

شرط کیسی شرط؟'' چاروں بونے پریشانی سے اکٹھے بولے۔

''ارے دوستو! گھبراتے کیوں ہو؟'' رنگیلا خرگوش مسکرایا۔

''بتا بھی دو کیا شرط ہے'' مائیکل جھنجھلایا۔

''جو لذیذ کیک تم لوگوں نے بنایا ہے اُس میں میرا حصّہ ڈبل ہوگا'' خرگوش نے شرط بتائی۔

''ہمیں منظور ہے'' چاروں اکٹھے بولے۔

''چلو پھر ویسی'' رنگیلے خرگوش نے بچی ہوئی گاجر کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالا اور سب بونوں کے گھر کی طرف اکٹھے روانہ ہوئے۔ گھر کے باہر پہنچ کر خرگوش نے کچی مٹی کھودنا شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس میں غائب ہو گیا۔ چند ہی منٹوں میں رنگیلا خرگوش چابی کے ساتھ باہر تھا۔

''یاہو رنگیلے خرگوش زندہ باد!'' چاروں بونوں نے خوشی سے نعرہ لگایا اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے کرسمس کی تیاریوں کے لیے جو جو سوچا تھا، وہ کر دکھایا تھا۔ اپنی محنت، ہمت اور لگن سے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو انہوں نے پار کر لیا تھا۔ چاروں خوش تھے کیوں کرسمس کی خوشی وہ پورے گاؤں کے ساتھ مل کر منانے والے تھے۔ اور سچی خوشی تو وہی ہے جو سب کے ساتھ مل کر منائی جائے۔ کرسمس کیک ہال کی میز پر رکھا تھا۔ پورا ہال جگمگا رہا تھا اور آنے والے مہمانوں کا منتظر تھا۔ ☆

اُمید کی کرن

رافعہ کاشف

ہمارے گھر گلاب کے تین پودے ہیں جن میں اکثر پھول بھی کھلتے ہیں۔ ایک دن میں نے ہاتھ لگایا تو ایک پھول کی پتی ٹوٹ گئی۔ مما کو پتا چلا تو انہوں نے پوچھا:

''پھول کیسے ٹوٹا؟'' میں نے سچ بتا دیا کہ میرے ہاتھ لگانے سے اس کی یہ پتی جھڑ گئی ہے۔ اس کے بعد مما نے ہمیں ایک کہانی سنائی۔ وہ آج آپ لوگوں کو بھی سناتی ہوں۔

کسی جگہ ایک بہت بڑا باغ تھا جہاں بہت سے گلاب کے پودے تھے۔ ڈھیر سارے پھول اور کلیاں وہاں بسی خوشی رہتے تھے۔ باغ میں آنے والے بچے پھولوں کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے اور پھول بچوں کے چہروں پر آنے والی مسکراہٹ دیکھ کر ہوا کے ساتھ خوشبو بن کر کھیلتے۔ باغ کا مالی پھولوں کا بڑا خیال رکھتا تھا صبح شام انہیں ٹھنڈے پانی سے نہلاتا کیاریاں صاف کرتا نئی کھلنے والی کلیوں کو پیار سے خوش آمدید کہتا جو پھول اور پودے بوڑھے ہو کر جھڑ جاتے انہیں احتیاط سے مٹی میں دباتا۔

سارا باغ مالی سے بڑا خوش تھا۔ صبح صبح لوگ باغ میں چہل قدمی کرنے آتے تو پھولوں کی خوشبو انہیں خوش آمدید کہتی جس سے وہ تازہ دم اور صحت مند ہو جاتے۔ شام کو بچے کھیلنے آتے تو ان کی خوشبو بچوں کے ساتھ کھیلتی پھرتی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا آہستہ آہستہ باغ میں لوگوں کا آنا کم ہو گیا مالی بابا بھی کبھی کبھی ہی نظر آتے اور پھر ایک دن باغ کے دروازے پر ایک بورڈ لگا نظر آیا جس پر لکھا تھا۔

''لاک ڈاؤن کی وجہ سے باغ میں داخلہ ممنوع ہے۔'' اب تو سارے پھول پودے بڑے پریشان ہوئے کہ یہ لاک ڈاؤن آخر کیا چیز ہے کہ اس نے باغ پر قبضہ کر کے لوگوں کو آنے سے روک دیا۔ کیا یہ لاک ڈاؤن اتنا طاقتور ہے کہ سارے شہر کے ہزاروں لوگوں کو اپنی مرضی سے چلنے پھرنے کھیلنے کودنے سے بھی روک دیا۔ سارے پھول رونے لگے۔

باغ کے ساتھ والی سڑک بھی بالکل سنسان ہو گئی تھی۔ کئی دن گزر گئے باغ کے پھولوں کی خبر لینے کوئی نہ آیا۔ بہت سے پھول جھڑ گئے تھے وہ کیاریوں ہی میں پڑے رہ گئے اور ان کی ٹہنیوں پر موجود ان کا خاندان انہیں یوں بے بس پڑا دیکھ کر روتا رہا۔ بہت سی نئی کونپلیں پانی نہ ملنے اور خیال نہ رکھے جانے کی وجہ سے کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئیں، لیکن اب بھی کوئی نہ آیا باغ کی خبر لینے۔ آہستہ آہستہ مٹی پوری طرح خشک ہو گئی۔ پودوں کی جڑیں زمین کے اندر بھاگ بھاگ کر پانی کی تلاش میں ناکام ہو گئیں۔ نئے پرانے سب پھول پودے مرجھا گئے۔ گیٹ پر لگا بورڈ مٹی سے بھر گیا پر اب بھی کوئی نہیں آیا۔

لیکن اب بھی کچھ ٹہنیاں ہمت سے کھڑی تھیں اور باغ کی ہریالی لوٹ آنے کا انتظار کر رہی تھیں، کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ صبر اور ہمت کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ اپنا رحم ضرور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ پھر ایک دن انہیں اپنے صبر کا پھل مل گیا۔ ایک صبح جب تیز دھوپ نے بچے کھچے پودوں کو جلا کر راکھ کرنے کی پوری کوشش کر رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو پیاسے پودوں کے صبر اور ہمت پر بڑا پیار آیا۔ وہ اللہ تعالیٰ تو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے تو وہ آخر اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم معصوم پودوں کو پیاسا دیکھ کر کیوں نہ ان کی پیاس بجھاتا۔ اچانک گڑ گڑ کرتے بہت سے بادل آئے اور خوب برسے۔ سارا باغ جل تھل ہو گیا مرجھائے پھول پھر سے تازہ ہو گئے۔ مٹی نے بھی بہت سا پانی جذب کر کے جڑوں کو پلایا۔ سارے پودے خوشی سے ناچنے لگے۔ سب نے مل کر اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کیوں کہ وہ بارش نہ برساتا تو سارا باغ مٹی کا ڈھیر ہو جاتا۔ کچھ دنوں میں ہر ٹہنی پر نئی کونپلیں کھلنے لگیں۔ چند ہفتوں میں سارا باغ پھر سے پھولوں سے بھر گیا اور ہاں وہ بورڈ بھی تو اتر گیا تھا جس پر لکھا تھا کہ:

''لاک ڈاؤن کی وجہ سے باغ میں داخلہ ممنوع ہے۔'' باغ کی تمام رونقیں پھر سے واپس آ گئیں۔

مما سے یہ کہانی سننے کے بعد میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی پھول نہیں توڑوں گی اور اپنی کیاری کا ہمیشہ بہت خیال رکھوں گی اُسے وقت پر پانی دوں گی تاکہ میری کیاری میں لگے پھول کبھی نہ مرجھائیں۔

☆.....☆.....☆

خونی خواب

مہرین ابراہیم

وہی بھیانک رات، آخری پہر کا سناٹا اور وہی خونی خواب۔ خون میں لت پت دو ہاتھ جو میری طرف بڑھتے ہیں۔ دس سال کی عمر سے ایک ہی خواب ہر ماہ، چاند کی 14 تاریخ، رات کے آخری پہر دیکھتی ہوں۔

دادی نے آج ماہر نفسیات سے میری اپائنٹمنٹ لی تھی۔ سیشن کے بعد میں بہت مطمئن تھی۔ ماہر نفسیات نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں کچھ دنوں کے لیے کہیں گھوم آؤں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفر میری زندگی بدل دے گا۔

.....☆.....

میرے والدین ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ پھر مجھے دادی نے ماں بن کر پالا۔ دادی نے سوچا کہ کچھ عرصے کے لیے لندن جانا چاہیے۔ ہم نے رختِ سفر باندھا اور روانہ ہو گئے۔ ایئر پورٹ پر ہمیشہ کی طرح رش تھا۔ ہر طرف لوگ کہیں اپنے پیاروں کو الوداع کہتے نظر آتے تو کہیں ان کے انتظار میں آنکھیں بچھائے۔ انسانوں کے اسی سمندر میں ہم اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی اور میں لاؤنج میں کھڑی شیشے کے دروازے سے دوسرے جہازوں کو پرواز کرتے دیکھتی رہی۔ مجھے ہمیشہ سے اڑان پسند ہے۔ اڑان بھرتا ہوا جہاز مجھے امید دیتا ہے۔ طویل سفر کے بعد ہم لندن پہنچ گئے۔ ہوٹل پہنچ کر تھوڑا آرام کرنے کے بعد میں سیر کے لیے نکل پڑی۔ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اس لیے کافی چہل پہل تھی۔

لوگوں سے بھاگتی، سکون کی تلاش میں، میں ایک نسبتاً پُرسکون کونے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میری نظر ایک سائن بورڈ پر پڑی۔

"جایئے اپنے خواب اور مستقبل۔" انٹری فیس ادا کر کے میں ایک کمرے میں پہنچی۔ ایک بے حد حسین خاتون، جو شکل سے لبنانی یا مصری معلوم ہوتی تھی، گلابی رنگ کے لبادے میں میرے سامنے تھی۔ ان کے سامنے ایک شیشے کا گولہ رکھا تھا جس سے گلابی شعاعیں نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک تکونہ پزل دے کر اس نے مجھ سے کہا کہ اسے حل کرتے کرتے اپنا خواب اسے بتاؤں۔ جیسے جیسے وہ سنتی گئی، اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا گیا ایک جاتا گیا۔ خواب مکمل ہوتے ہی اس نے سامنے رکھے شیشے کے جار

پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''تم نئے سال کی رات ریلوے اسٹیشن کے پاس والی جھیل پر جانا۔ وہاں تمہیں اپنے سوالوں کے جواب ملیں گے۔''

☆.....

گھڑی نے دس بج کر دس منٹ پر الارم بجایا۔ میں تیار ہو چکی تھی اور تھوڑی دور چلنے کے بعد بتائی ہوئی جھیل پر پہنچ گئی۔ سنسان علاقہ، جھیل کے پانی میں چاند کا عکس اور رات کی سیاہ چادر اوڑھے خاموشی، آنے والے طوفان کا اشارہ دے رہی تھی۔ ماحول میں پراسراریت بھری ہوئی تھی۔

''دھڑپ دھڑپ۔''

دور سے ایک بگھی آتی دکھادی۔ میرے قریب آ کر کوچوان نے بگھی روک دی۔

''تشریف رکھیں۔'' اس نے مجھے ایسے مخاطب کیا جیسے یہ کوئی معمول ہو۔ میں ایک خواب ناک کیفیت میں بگھی میں بیٹھ گئی۔

بگھی چلتے چلتے ایک محل کے سامنے رکی جو برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ موسیقی کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میں پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ شیشے کا وسیع و عریض ہال اور ہر طرف روشنی ہی روشنی، ایک ویٹر نے آ کر میرے سامنے ٹرے بڑھایا۔ اس میں لال، ہرے، نیلے، گویا کہ بہت سے رنگوں کے ماسک تھے۔ یہ ایک پارٹی تھی۔ میں نے اپنے لیے سنہری ماسک منتخب کیا۔ اچانک کوئی میرے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی سنہری ماسک پہن رکھا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک تہہ خانے میں لے آیا۔ میں جیسے نیند سے جاگ گئی۔

''یہ یہ تو وہی جگہ ہے۔ کک۔۔ کون ہو تم سب۔''

ڈرو مت! یہ جگہ تمہاری ہی ہے۔ تم بھی تو ہم ہی میں سے ہو۔ بس راستہ بھٹک گئی تھی۔ مگر ہم تمہیں واپس لے آئے۔''

''کون ہوں میں؟''

''میری ملکہ، ہو تم۔ جنگل کی رانی، شیطان کی پجارن، بس ایک منزل دور ہو تم، پھر میں اور تم راج کریں گے دنیا پر۔'' اس کے خون آلود ہاتھ میری طرف بڑھے۔ اسی لمحے بچپن کی یادوں سے ایک یاد نے سر اٹھایا۔ دادی قرآنی آیات پڑھ کر دم کرتی تھی، کہتی تھی بابا شیطان کی گرفت میں آ گئے تھے اور جان گنوادی تھی۔ میرے ہونٹوں نے ایک دم ان آیات کا ورد شروع کر دیا۔ اسی لمحے وہاں آگ لگ گئی۔ تب ہی مجھے بابا نظر آئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے نکال لائے۔ میں نے خود کو اسی جھیل پر پایا جہاں وہ بگھی ملی تھی۔ واپس آ کر میں نے دادی کو سب بتایا۔ مجھے آخر کار اس خواب سے چھٹکارا مل گیا تھا۔

میں اُس خونی خواب کے شکنجے سے نکل گئی تھی۔ ☆

بقیہ: بکھرے

اٹھی جوان کی گردنوں تک اترتی چلی گئی۔ ہوش و حواس کھوتے وہ بھی عباس کے قریب گر پڑے تھے۔ قریب ہی دو اینٹیں زمین سے ٹکراتی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر گئیں۔

سورج کے سر پر چڑھتے ہی تینوں کو ہوش آیا۔ ان کے کیمپ کی زپ بند تھی جسے کھول کر وہ باہر نکل آئے جہاں اقبال انکل ساتھ لائی ٹوکری میں سے بچا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔

''ارے بچو! آپ تینوں تو اپنا کیمپ بند کیے بغیر ہی سو گئے تھے۔ رات کو جب میں اٹھا تو میں نے بند کر دی۔'' تقی، عباس اور شہیر کے سر میں اب بھی درد ہو رہا تھا۔ کسی بھی اور چیز کی طرف دھیان دیے بغیر تینوں سامان سمیٹنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ اپنا بوریا بستر باندھ کر گاڑی میں سوار وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو انہیں وہاں ایک بوڑھا اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا ملتا۔ اس کے دائیں کندھے پر اس کی چڑیا اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ☆

بقیہ: مہکتے پھول

داخل ہوا۔ پھول تازہ تھے جس سے دفتر مہک گیا تھا۔ گل دستہ پر ایک خوب صورت کارڈ پر لکھا تھا۔ ''پیارے بھائی ندیم! کے لیے تازہ پھولوں کا تحفہ!'' فقط: نصیر رضا

ندیم کے پوچھنے پر ملازم نے بتایا کہ ایک آدمی یہ پھول دے کر گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی نصیر کے ساتھ ہوا۔ مہکتے پھولوں نے اس کے دفتر کو بھی مہکا دیا تھا۔ بڑے بھائی ندیم رضا کا بھیجا ہوا گل دستہ دیکھ کر نصیر کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ کاروبار کی تقسیم کے وقت اس نے کئی مرتبہ بڑے بھائی سے بدتمیزی کی تھی۔ انھیں غصے سے گھورا تھا۔ بچے اس ترکیب کا نتیجہ دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ دونوں کے دفاتر سے وہ ملازمین کے ذریعے لمحہ بہ لمحہ ہر بات سے باخبر تھے۔

اس وقت ان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، جب نصیر رضا اپنے بڑے بھائی کے دفتر میں داخل ہو رہا تھا۔ لوہا گرم تھا، اس لیے وہ لمحہ ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد سارے بچے ندیم رضا کے دفتر جا پہنچے۔ دونوں بھائیوں نے بہ غور بچوں کو دیکھا تازہ پھولوں کے درمیان پھول جیسے بچے کھڑے تھے۔

پھولوں کا معاملہ حل ہوا تو دونوں بھائیوں نے جان لیا کہ کاروبار تقسیم کیا جائے۔ محبت تقسیم نہ کی جائے۔ ننھے پھولوں نے مہکتے پھولوں کا تحفہ بھیج کر نفرت کی دیوار کو گرا دیا تھا۔ بچوں کی ترکیب کام یاب ہو گئی تھی۔ نصیر نے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا:

''کیا عید کی خریداری کے لیے تیار ہو؟''

''جی، ہم سب تیار ہیں۔'' بچوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

''تو میں بھی تیار ہوں، آجاؤ پھر بازار چلتے ہیں۔'' نصیر کی شوخ آواز دفتر میں گونجی تو ندیم کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ ☆

مہکتے پھول

نذیر انبالوی

مہکتے پھولوں نے محبت کو تقسیم ہونے سے بچالیا تھا۔

گھر تو ان کے الگ الگ ہو گئے مگر اسکول ابھی تک ایک ہی تھا۔ اسکول بھی الگ ہو جاتے اگر سالانہ امتحان قریب نہ ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے اب کسی دوسرے اسکول میں داخلہ ممکن نہیں تھا۔ چند دن پہلے سارے بچے ایک ہی گاڑی میں اسکول آتے، اب الگ الگ گاڑی میں اسکول پہنچتے تھے۔

انھیں یہ ہدایت ملی تھی کہ آپس میں بات چیت نہیں کرنی۔ دانیال اور عبدالرحمٰن کی تو ایک ہی جماعت تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ کلاس ٹیچر کو دانیال کے ابو کا فون آ گیا کہ میرے بیٹے کو عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھنے نہ دیا جائے۔

کلاس ٹیچر مس مائرہ نے انھیں الگ کرنا چاہا تو وہ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے آنسوؤں سے مس مائرہ کا دل نرم پڑ گیا۔ جب دونوں کی زبانی انھیں ساری بات کا علم ہوا تو انھیں اکٹھے، بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

''مانو کیسی ہے؟'' دانیال نے پوچھا۔

''میرے طرح وہ بھی اُداس ہے۔ میاؤں میاؤں کرتے ہوئے تمھارے کمرے میں چلی جاتی ہے، کمرا خالی دیکھ کر میاؤں میاؤں کرتے ہوئے باہر آجاتی ہے۔'' عبدالرحمٰن نے بتایا۔

''گھر جاؤ گے تو مانو کی تصویر تو واٹس ایپ کرنا، چار دن سے مانو کی صورت نہیں دیکھی، میں بھی مانو کے بغیر اُداس ہوں۔'' وہ کافی دیر تک مانو کی باتیں کرتے رہے۔

چھٹی کے بعد دانیال گھر پہنچا تو امی جان نے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھے تھے یا الگ۔ وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا اور سچ بول کر امی جان کے غصے کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا، اس لیے خاموشی کو اپنے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہو گیا۔ حمزہ اور مناہل بھی کوئی بات کیے بغیر اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

عبدالرحمٰن کے ہاں بھی ایسی ہی صورت حال تھی، عبدالرحمٰن اور عائشہ یونی فارم سمیت کھانے کی میز پر موجود تھے، امی جان پہلے سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ شور، ہنگامہ اور شرارتیں تو گویا گھر سے حمزہ، مناہل اور دانیال کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھیں۔

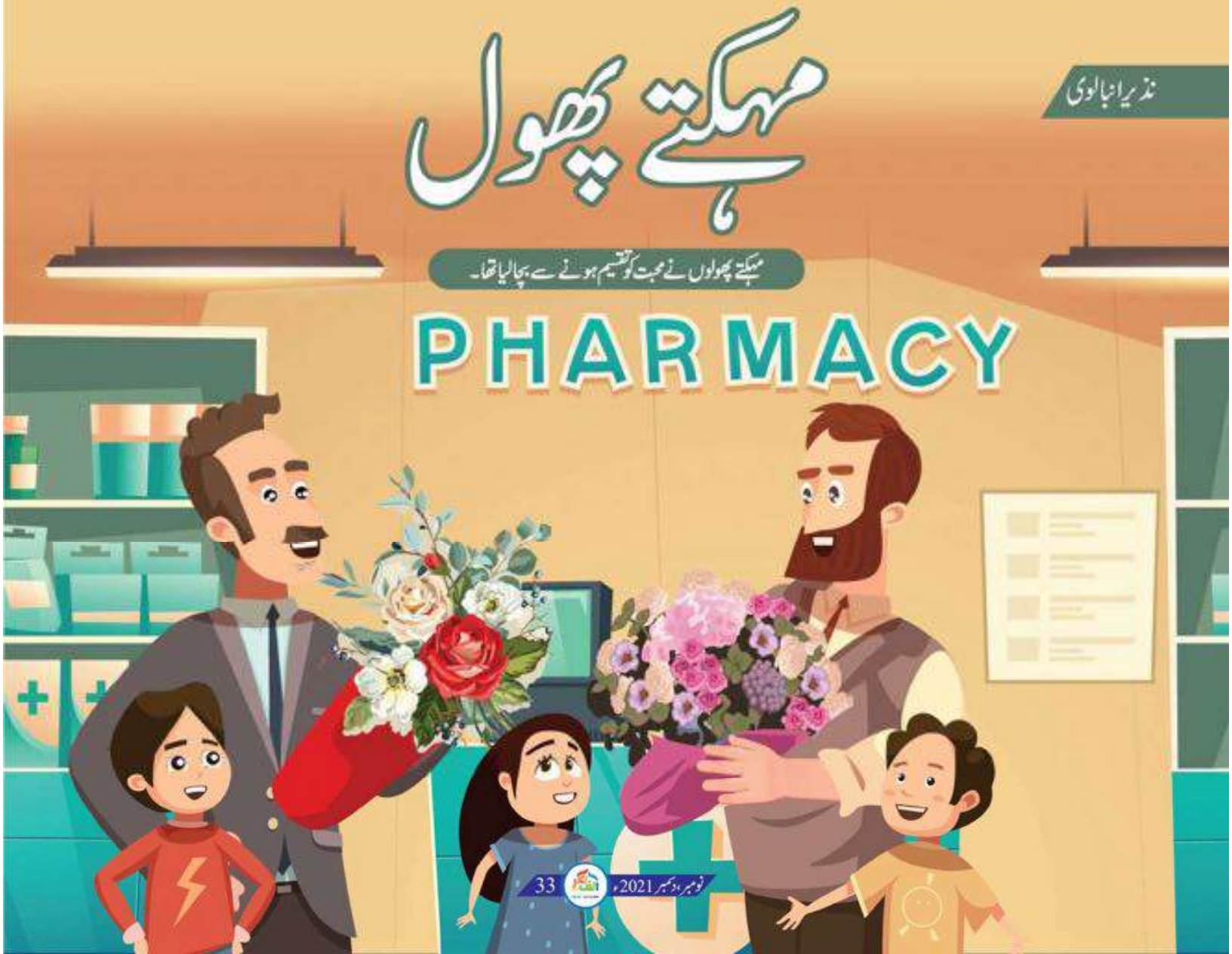

کیا خوب صورت دن تھے۔ چچا جان بچوں کے ناز نخرے برداشت کرتے نہ تھکتے تھے۔ ادھر بچوں نے آئس کریم کھانے کی فرمائش کی اُدھر چچا نصیر گاڑی میں ہارن بجا کر یہ اعلان کرتے دکھائی دیتے کہ آؤ چمن آئس کریم چلتے ہیں۔ عبدالرحمٰن، عائشہ، حمزہ، منابل اور دانیال تیزی سے باہر کی طرف لپکتے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھلتا اور بند ہوتا۔ پھر گاڑی مال روڈ کی طرف روانہ ہو جاتی۔ بچے تمام راستہ شور کرتے، شرارتیں کرتے۔ کیا حسین وقت تھا۔ یہ وقت گزر گیا۔

شام کو عبدالرحمٰن نے میاؤں میاؤں کرتی مانو کی تصویر دانیال کو واٹس ایپ کی تو اس نے بے اختیار یہ جملہ لکھا:

''پیاری مانو! میں تمھیں ملنے آؤں گا تمھارے بغیر میں بہت اُداس ہوں۔''

اس سے قبل کہ عبدالرحمٰن اس جملے کا کوئی جواب لکھتا۔ دانیال نے فوراً دوسرا جملہ لکھا

''پیاری مانو! میں شاید تمھیں گھر ملنے نہ آسکوں گا، تایا جان اور بابا جان نے کہا ہے کہ اب تم سب کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں، تم میں سے کوئی اس گھر میں آیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں تمھیں کہیں باہر مل لوں گا پیاری مانو، میں تمھیں ہر وقت یاد کرتا ہوں، عبدالرحمٰن نے بتایا ہے کہ تم بھی مجھے یاد کرتی ہو، میرے کمرے میں جاتی ہو۔ مجھے تلاش کرتی ہو، پیاری مانو خوش رہو اور اسی طرح میاؤں میاؤں کرتی رہو۔''

گلشن رحمت میں خوشیوں بھرا یہ گھر اس وقت اداسی کے سپرد ہوا جب دو سگے بھائی نصیر اور ندیم کاروباری سلسلے میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کے والد نے تیس سال قبل نور کالونی میں سرکاری ہسپتال کے قریب ایک میڈیکل سٹور کھولا تو دیکھتے ہی دیکھتے کاروبار چل نکلا۔ ان کے والد نے آبائی زمین بیچ کر دکان خرید لی۔

وقت کے ساتھ ساتھ کاروبار بڑھتا چلا گیا۔ چار سال بعد ساتھ والی دکان بھی خرید کر میڈیکل سٹور کو بڑا کر لیا گیا۔ اب سٹور میں ملازمین کی تعداد پانچ ہو گئی تھی۔ نصیر اور ندیم میڈیکل سٹور آنے لگے۔ اس دن ان کے والد احمد رضا بہت خوش تھے جب سلامت روڈ پر اپنے میڈیکل سٹور کا آغاز ہوا تھا، نئی برانچ بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ندیم انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے پہلی برانچ میں آنے لگا۔

نصیر صرف میٹرک تک ہی تعلیم حاصل کر سکا۔ وہ بھی اب کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔ ادویات ساز کمپنیوں سے رابطہ کرنے کا اہم کام اس کے ذمے تھا۔ رضا میڈیکل سٹور پر لوگ اعتماد کرنے لگے تھے کہ جہاں اصلی ادویات دستیاب ہوتی ہیں۔ اب ان کی ایک اور برانچ کا گلشن آفتاب میں آغاز ہو گیا تھا۔ چار سال میں دس برانچز پورے شہر میں چوبیس گھنٹے کھلی رہتی تھیں۔

ندیم کی شادی والدین کی زندگی میں ہو گئی۔ پھر ایک خوف ناک حادثے کے باعث والدین جیسی انمول نعمت ان سے چھن گئی۔ موٹروے پر گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا جس سے ڈرائیور سمیت ندیم اور نصیر کے امی ابو بھی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ندیم نے بڑا بھائی ہونے کے ناتے سارے کاروبار کا نظام سنبھال لیا۔

نصیر اپنے بھائی کی ہر بات کو اہمیت دیتا تھا۔ عبدالرحمٰن اور عائشہ کے پیدا ہونے پر گھر میں رونق آ گئی۔ نصیر بچوں پر جان چھڑکتا تھا۔ ان کی ہر فرمائش پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا۔ اپنے بچے ہونے کے بعد بھی یہ محبت کم نہ ہوئی۔ حمزہ، منابل اور دانیال کے ماحول کو مزید خوش گوار بنا رہا تھا۔

عید کے موقع پر خریداری کرنے کے لیے سبھی بچے نصیر انکل کے ساتھ بازار جاتے۔ خوب خریداری کرتے۔ سب کو عیدی ملتی، واہ کیا محبت بھرے دن تھے۔ پھر یہ دن بیت گئے۔ رشتوں کے درمیان دولت آ کھڑی ہوئی۔ اختیارات کی جنگ شروع ہو گئی۔ بڑے بھائی ندیم کے سامنے سر جھکانے کے بجائے نصیر سر اٹھا کر مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ خاندان کے چند بڑوں نے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی مگر بات بگڑتی چلی گئی۔

آخر کاروبار الگ الگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سارا کاروبار دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہو گیا۔ نفرت نے محبت کی دیوار کو ایک ہی جھٹکے میں گرا دیا تھا، کاروبار تقسیم ہوا تو گھر بھی الگ الگ ہو گئے۔ اب اسکول الگ ہونا باقی تھا۔ شاید دو ماہ بعد سالانہ امتحان کے بعد ایسا ہو بھی جائے۔ اسکول میں بچے ملتے، خوب باتیں کرتے اور جب چھٹی کے وقت اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھتے تو اداس ہو جاتے۔

ایک شام عبدالرحمٰن پارک میں مانو کو لے آیا۔ پروگرام کے مطابق دانیال بھی وہاں پہنچ گیا۔ مانو اسے دیکھتے ہی اچھل کر اس کی گود میں آ گئی۔ مانو کی میاؤں میاؤں بتا رہی تھی کہ وہ بھی دانیال کے بغیر اداس تھی۔ پارک سے واپسی پر مانو میاؤں میاؤں کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی تو دانیال دیر تک ہاتھ ہلا ہلا کر اسے الوداع کرتا رہا۔

رمضان المبارک کا آغاز ہوا تو دونوں گھروں میں وہ پہلے جیسی رونق اور گہما گہمی نہ تھی۔ پہلے تو ایسا نہ ہوتا تھا۔ چچا نصیر بچوں کو لے کر بازار جاتے تھے، دونوں گھروں میں اب سناٹا تھا۔ ندیم اور نصیر کاروبار میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ انھیں بچوں کا ذرا بھی تو خیال نہ تھا۔ ایک دن سارے بچے اسکول میں مل بیٹھے، عبدالرحمٰن ان میں سب سے بڑا تھا۔ سب اسے بھائی جان کہتے تھے۔

''بھائی جان! ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔ اس طرح تو عید کا مزا نہیں آئے گا۔''

''مجھے کچھ سوچنے دو۔'' یہ کہہ کر عبدالرحمٰن کچھ سوچنے لگا۔ چند منٹوں بعد اس نے سب کو مخاطب کیا: ''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔''

پھر اس نے ترکیب سب بچوں کو بتا دی۔

''ہمیں اس ترکیب پر فوری طور پر عمل کرنا چاہیے۔'' یہ آواز حمزہ کی تھی۔

ندیم شام کے وقت اپنی مین برانچ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملازم گل دستہ لے کر دفتر میں

بقیہ صفحہ نمبر: 32

پراسرار گڑیا

آمنہ ارشد

''اُف! مجھ سے بالکل بھی انتظار نہیں ہو رہا!'' نجانے ایما کتنی مرتبہ یہ بات دہرا چکی تھی۔ ''ہاں ہاں! میں جانتی ہوں کہ کل تمہاری سالگرہ ہے لیکن اب اتنی بھی کیا بے چینی؟'' ایما کی ممی نے ذرا اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''آخر کب گزرے گا یہ دن؟'' ایما کے لیے انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''پتا نہیں سارہ آنٹی نے اس مرتبہ میرے لیے کیا خریدا ہوگا؟ ان کے تحفے ہمیشہ سب سے مختلف ہوتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے عجیب و غریب؟'' ممی نے اسے چھیڑا۔

''آپ جانتی ہیں مجھے ایسی ہی چیزیں پسند ہیں۔ عجیب و غریب اور ذرا ڈراؤنی!'' ایما نے جوش سے کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن پھر رات کو ڈر کر میرے پاس سونے کے لیے مت آنا۔'' ممی نے اسے پیار سے تنبیہ کی۔ ''ممی! اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔'' ایما نے منہ بسور کر کہا۔

ایما کی پسند بھی نرالی تھی۔ اسے ہمیشہ سے ڈرانے قصے کہانیوں میں دلچسپی رہی تھی اور وہ اسی قسم کی چیزیں بھی اکٹھی کرتی رہتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے اپنے جیسی ایک دوست بھی مل گئی تھی۔ سارہ سے اس کی گہری دوستی تھی۔ وہ اس کی ہم عمر تھی اور ملائشیا میں رہتی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ جن بھوتوں کے نت نئے قصے ہوتے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ایما اور اس کی فوراً ہی دوستی ہو گئی۔ کھانا ختم کر کے ایما اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سالگرہ کی تقریب کی تمام تیاریاں وہ پہلے ہی مکمل کر چکی تھی۔ لاؤنج میں ساری سجاوٹ کی جا چکی تھی۔ اس مرتبہ اس نے روشنی کا انتظام بھی ایسا کیا تھا کہ ایک پراسرار گھر کا سا ماحول بنایا جا سکے۔ ایسے آئیڈیاز اسے اکثر سارہ آنٹی ہی دیتی تھی۔

سارہ آنٹی اس کی ممی کی بڑی بہن تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی ممی سے زیادہ سارہ آنٹی پر گئی ہے۔ اور یہ کوئی ایسی ناقابلِ یقین بات بھی نہیں تھی۔ اس کی اور سارہ آنٹی کی پسند ناپسند بہت ملتی تھی۔ ڈراؤنی چیزیں جمع کرنے کا شوق اس نے سارہ آنٹی سے ہی لیا تھا۔ سارہ آنٹی کئی سالوں سے امریکہ کی ایک دوسری ریاست میں رہائش پزیر تھی لیکن اس کی سالگرہ کے دنوں میں وہ کیلیفورنیا ضرور آتی۔ ان کے دیے ہوئے تحفے ایما کو ہمیشہ ہی بہت پسند آتے۔ لیکن ممی کو ان کی چوائس پر سخت اعتراض ہوتا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایما اس قسم کی خوفناک چیزیں اپنے کمرے میں رکھنے لگی تو اسے ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے گے۔ لیکن ان کی سنتا ہی کون تھا۔

صبح ہوتے ہی ایما دوڑتی ہوئی نیچے چلی آئی۔ ممی نے اسے گلے لگا کر سالگرہ کی مبارکباد دی۔ سارہ آنٹی بھی صبح کی فلائٹ سے پہنچ چکی تھیں اور اب اپنا سامان کھول رہی تھی۔

''میرا تحفہ؟'' ایما سے رہا نہیں گیا۔

''وہی دے رہی ہوں بھئی!'' سارہ آنٹی نے ہنستے ہوئے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایما نے فوراً پیکنگ کھولی لیکن اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''یہ کیا؟ گڑیا؟ آپ کو معلوم تو ہے کہ یہ عام لڑکیوں والی چیزیں مجھے بالکل پسند نہیں۔'' وہ اپنی مایوسی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''ارے بھئی! یہ کوئی عام گڑیا نہیں ہے۔ تم ذرا غور تو کرو۔''

ایما گڑیا کو غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بڑی بڑی کالی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ایک خوبصورت گڑیا تھی لیکن اس میں کوئی اور بات بھی تھی جو اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اچانک اسے گڑیا کی آنکھوں کی پتلیاں ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ میرا وہم ہے۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔

''یہ کوئی عام گڑیا نہیں ہے۔ میں نے اسیڈان ٹاؤن میں قدیم نوادرات کی ایک دکان سے خریدا ہے۔ میں اکثر وہاں کا چکر لگاتی رہتی ہوں۔ اس مرتبہ جب میری نظر اس گڑیا پر پڑی تو مجھے تمہارا خیال آیا اور میں نے فوراً اسے تمہارے لئے خرید لیا۔''

سارہ آنٹی کی بات سنتے سنتے اس کی نظر دوبارہ گڑیا پر پڑی۔ اسے محسوس ہوا جیسے گڑیا کی پیشانی پر بل آیا ہو۔ یا پھر شاید یہ اس کا گمان تھا۔ گڑیا سے نظریں چرا کر وہ دوبارہ سارہ آنٹی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''اس گڑیا کے دکان تک پہنچنے کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ دکاندار کے مطابق ایک صبح اس نے دکان کھولی تو دروازے پر اسے ایک ٹوکری ملی جس میں یہ گڑیا رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ایک تحریر بھی تھی۔ اس نے مجھے وہ بھی دے دی۔ یہ دیکھو!'' سارہ آنٹی نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

''اس شرارتی لڑکی کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔'' کاغذ پر درج تھا۔

''اب اس کا کیا مطلب ہوا؟ گڑیا میں کوئی تو بات ایسی تھی جو اسے مسلسل بے چین کر رہی تھی لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شام ہوتے ہی اس کی سہیلیاں سالگرہ کی تقریب میں شامل ہونے کے لئے اس کے گھر پہنچنے لگیں۔ کوئی چڑیل کے روپ میں تھی تو کوئی ویمپائر کے۔ پارٹی کے دوران بھی ایما کا دھیان مسلسل گڑیا کی طرف ہی تھا۔ سب نے خوب ہلا گلا کیا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ روزی کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ جلد از جلد کسی سے اپنے شکوک کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔

''یہ سارہ آنٹی نے مجھے تحفے میں دی ہے، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کچھ کہنا چاہ رہی ہوں۔''

''مجھے تو اس کی آنکھوں سے خوف آ رہا ہے۔ پلیز اسے کہیں باہر رکھ آؤ۔ میں اس کی موجودگی میں سو نہیں سکوں گی۔''

روزی کے ڈر کو دیکھتے ہوئے ایما فوراً گڑیا کو اٹھا کر باہر گیراج میں رکھ آئی۔ وہ خود بھی اس کی کمرے میں موجودگی سے خائف تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کر کے اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ صبح اس کی آواز ممی کے چلانے کی آواز سے کھلی۔ وہ اسے سکول کے لیے اٹھانے آئی تھی۔ روزی پہلے ہی جاگ چکی تھی اور اب نیچے اس کا انتظار کر رہی تھی تاکہ دونوں اکٹھے سکول جا سکیں۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن پھر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ گڑیا سامنے شیلف پر موجود تھی۔

''لیکن میں نے تو خود اسے رات کو باہر۔'' وہ شاک کے عالم میں تھی۔

''شاید ممی یا روزی نے اسے یہاں رکھ دیا ہو۔'' اس نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ تیار ہوتے ہوئے اسے مسلسل خود پر کسی کی نظریں محسوس ہوتی رہیں۔ ممی کے سامنے وہ اس بات کا ذکر نہیں کر سکتی تھی ورنہ اس کے ایڈونچرز پر پابندی لگ جاتی۔ شدید الجھن کے عالم میں وہ سکول چلی آئی۔ کل سالگرہ کی مصروفیت کی وجہ سے وہ اپنا میتھس کا ہوم ورک بھی نہیں کر پائی تھی۔ الجبرا کے سوالوں سے ویسے بھی اس کی جان جاتی تھی۔ کاپی کھولتے ہوئے وہ کوئی بہانہ سوچنے لگی۔ لیکن اسے ایک اور حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس کا سارا ہوم ورک مکمل تھا۔

''یہ کیسے ہوا؟ یہ میں نے تو نہیں کیا تھا۔'' اس نے ساتھ بیٹھی روزی کو مخاطب کیا۔

''لیکن یہ تو تمہاری ہی لکھائی ہے۔ تمہیں یاد نہیں ہوگا۔'' روزی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ روزی کو کیسے اپنی بات سمجھائے۔ ٹیچر کلاس میں آ چکی تھی اس لیے وہ مزید اس بارے میں کچھ نہ کہہ سکی۔ سکول سے واپسی پر روزی اس کے ساتھ ہی گھر آ گئی۔ اسے اپنی کچھ چیزیں لینی تھیں جو وہ اس کے کمرے میں چھوڑ گئی تھی۔ ایما کو نیچے چھوڑ کر وہ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ ابھی اسے گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایما کو روزی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

''مم۔۔ میں نے اسے ہلتے ہوئے دیکھا ہے۔'' روزی کا سانس پھول رہا تھا۔ ایما بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی۔ شیلف پر رکھی گڑیا کا رخ واقعی دوسری طرف تھا۔

''اسے فوراً باہر پھینکو۔ ضرور اس پر کوئی سایہ ہے۔'' روزی مسلسل چیخ رہی تھی۔ ایما کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے گڑیا کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ سڑک پر جا گری۔ اس کی پیشانی پر بل آیا تھا۔

اس پورے واقعے کے بارے میں اس نے ممی کو کچھ نہ بتایا۔ اس کا خیال تھا کہ کوڑا اٹھانے والے گڑیا کو بھی اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اگلے دن سکول جانے سے پہلے جب اس نے اپنی الماری کھولی تو گڑیا وہاں موجود تھی۔ اب تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ کوئی عام گڑیا نہیں ہے۔ کاش وہ سارہ آنٹی سے بات کر سکتی۔ لیکن وہ سفر میں ہوں گی۔ روزی کو سب کچھ بتانے کا سوچ کر وہ اسکول آ گئی لیکن وہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ آج روزی سکول ہی نہیں آئی۔ اسے حیرت ہوئی۔ روزی اسے بتائے بغیر کبھی سکول سے چھٹی نہیں کرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گھبرانے لگا۔ روزی شروع سے ہی گڑیا کے خلاف تھی۔ اگر گڑیا نے اسے کوئی نقصان پہنچا دیا ہوا تو۔ گھر

آ کر اس نے روزی کو کال کی۔ تیسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

''کہاں تھی تم؟ آج سکول کیوں نہیں آئی؟'' ایما نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''گریٹی کی طبیعت خراب تھی۔ ممی کو انہیں لے کر ہاسپٹل جانا پڑا۔ اس لیے میں نہیں آ سکی۔'' روزی کا جواب سن کر ایما کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ گڑیا نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے الماری کا پٹ کھولا۔ لیکن یہ کیا؟ وہ تو اپنی چیزیں یوں ہی بے ترتیبی سے الماری میں رکھ دیا کرتی تھی لیکن اب اس کی تمام اشیا سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ گڑیا ایک کونے میں اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ اسے گمان گزرا جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔

''اس نے پہلے میرا ہوم ورک کیا اور اب یہ الماری سیٹ کر دی۔ لگتا تو نہیں کہ یہ ہمیں کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

''یہ ہی تو وہ ایڈونچر ہے جس کی تلاش مجھے ہمیشہ رہتی تھی۔ کیا پتا اس گڑیا کو میری مدد کی ضرورت ہو۔'' اپنے اندر ہمت جمع کرتے ہوئے وہ گڑیا کو اٹھا کر اپنے بیڈ تک آ گئی۔

''تمہارا شکریہ! تم نے میری بہت مدد کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ کیا تم کوئی بدروح ہو یا پھر گڑیا کے روپ میں انسان؟'' اسے ایسا لگا جیسے گڑیا کی آنکھوں میں نمی امڈ آئی ہو۔

''دیکھو، میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے چند سوال کروں گی، تم چاہو تو اشاروں کے ذریعے جواب دے سکتی ہو۔'' اب تک ایما کو یقین ہو چلا تھا کہ گڑیا کو اس کی مدد کی ضرورت ہے۔

''کیا تم پہلی انسان تھی اور کسی نے تمہیں جادو کے زور سے گڑیا بنا دیا ہے؟'' گڑیا نے پلکیں جھپکائیں۔

''لیکن مجھے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ تم کون ہو؟'' گڑیا نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ ساری رات ایما شدید الجھن کا شکار رہی۔ اگلی صبح سکول پہنچتے ہی ایما نے روزی کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ ساری بات سن کر روزی بھی اس ایڈونچر کا حصہ بننے کے لیے تیار ہو گئی۔

''ایسا کرتے ہیں فری پیریڈ میں کمپیوٹر لیب چلیں گے۔ ہمیں پراسرار طور پر غائب ہونے والے لوگوں پر ریسرچ کرنی چاہیے۔'' روزی نے مشورہ دیا۔

''اس طرح تو بہت سے لوگ غائب ہوئے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی ہم کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔''

لیکن اس سے پہلے ایک اور عجیب بات ہوئی۔ آج سکول کی اسمبلی میں ماحول خاصا سوگوار تھا۔ پرنسپل نے خاصی سنجیدگی سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

''آج کا دن ہمارے لیے بہت سوگوار ہے۔ آج مارگریٹ مائیکل کو غائب ہوئے پچاس سال مکمل ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ مارگریٹ ہمارے ہی سکول کی ایک ہونہار طالبہ تھی۔ وہ بارہ سال کی تھی جب ایک دن اچانک وہ کہیں غائب ہو گئی۔ اس کے والدین نے پولیس کے ساتھ مل کر اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ آج تک کوئی یہ نہیں جان سکا کہ آخر اچانک وہ کہاں چلی گئی۔'' ایما اور روزی دم سادھے سنتی رہیں۔ اب پراجیکٹر پر مارگریٹ کی تصاویر دکھائی جا رہی تھیں۔ سیاہ آنکھیں، سنہری بال اور خوبصورت نقوش۔ وہ اس چہرے کو خوب پہچانتی تھی۔ اب اسے معلوم تھا کہ اسے آگے کیا کرنا ہے۔

گھر پہنچ کر وہ بھاگم بھاگ اپنے کمرے تک آئی۔ خلاف توقع گڑیا وہاں نہیں تھی۔

''ممی! میری گڑیا کہاں گئی؟'' اس نے آواز لگائی۔

''وہ تو تم نے خیرات کے لیے نکالے سامان کے ساتھ رکھی تھی نا؟ تو میں نے وہ بھی دے دی۔''

''کیا؟'' ایما کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''آپ کیسے میری گڑیا کسی کو دے سکتی ہیں اور وہ بھی سارہ آنٹی کا دیا ہوا تحفہ؟''

''بھئی تم خود ہی تو اسے ادھر ادھر پھینک دیتی ہو۔ جب سے آئی ہے تم نے ایک بار بھی اس کو خیال سے نہیں رکھا۔ مجھے تو یہ ہی لگا کہ تمہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔''

''پلیز، جن لوگوں کو سامان دیا ہے انہیں ابھی فون کر کے کہیں کہ گڑیا واپس کر دیں۔''

''اب تو کل ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ تم صبح تک انتظار کرو۔''

ساری رات نیند ایما کی آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔

''اگر اس نے یہ سمجھ لیا کہ میں نے جان بوجھ کر اسے چھوڑا ہے تو کہیں وہ مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش نہ کرے۔'' اسے طرح طرح کے وہم ستا رہے تھے۔ اچانک اسے اپنے کمرے کی کھڑکی کا پٹ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور پردہ ایک طرف سرکا دیا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ گڑیا اس کے سامنے تھی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم خود واپس آئی ہو۔'' حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے کہنے لگی۔

''مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم ناراض ہو کر مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دو۔''

''میں کیسے کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہوں؟ میں تو خود مصیبت کا شکار ہوں۔'' ایما کے ہاتھ سے گڑیا چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ گڑیا واقعی بولنے لگی تھی۔

''میں جانتی ہوں تم مارگریٹ ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم اس حال تک کیسے پہنچی؟'' آخر کار وہ ہمت کر کے پوچھنے لگی۔

''میں بھی تمہاری طرح ڈراؤنی قصے کہانیاں پڑھنے کی شوقین تھی۔ اکثر مجھے ایڈونچر کی تلاش رہتی۔'' مارگریٹ کہنے لگی۔ گڑیا کو باتیں کرتا دیکھ کر ایما کو عجیب سا لگ رہا تھا لیکن وہ اشتیاق سے سنتی رہی۔

''جب میں سکول میں تھی تو ایک بوڑھی عورت کا قصہ کافی مشہور تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کے پاس جادوئی طاقت ہے، اسی لیے سب اس سے ڈرا بچ کر رہتے تھے۔ لیکن مجھے اسے جاننے کا بہت تجسس تھا۔ ایک روز سکول سے چھٹی کے بعد میں اس علاقے میں چلی گئی جہاں وہ رہتی تھی۔ اس کے گھر کے باہر پہنچ کر میں کھڑکی سے اندر جھانکنے لگی۔ وہ ایک بڑے سے دیگچے میں کچھ پکا رہی تھی۔ کچھ دیر بچ بلانے کے بعد وہ قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر وہ اسی طرح مراقبے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہی اور پھر اچانک اس نے سر اٹھا کر سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا۔ اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتا پا کر میں بے حد خوفزدہ ہوگئی اور سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اگلے تین دن مجھے شدید بخار رہا۔ چوتھے روز جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کسی پرانی سی دکان میں پایا۔ میں گڑیا میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور اتنے سال اس دکان میں بے یار و مددگار پڑے رہنے کے بعد اب تمہارے گھر آئی ہوں۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' ایما افسوس سے کہنے لگی۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے گھر والوں نے تمہیں بہت تلاش کیا تھا۔ خاص طور پر تمہاری بہن نے تو کئی سالوں تک کوشش جاری رکھی۔ ہمیں چاہیے کہ اس بڑھیا کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں جس نے تمہیں اس حال میں پہنچایا ہے۔ وہی تمہیں واپس انسانی شکل میں لا سکتی ہے۔''

''لیکن اس بات کو تو کئی سال گزر چکے ہیں۔ اب تو شاید وہ زندہ ہی نہ ہو۔'' مارگریٹ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس عورت کو ڈھونڈنا ویسے بھی بہت مشکل تھا اور اگر وہ مل بھی جاتی تو اس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ وہ مارگریٹ کو دوبارہ اس کی اصلی حالت میں لانے پر راضی بھی ہو جاتی۔

اگلے روز ایما مارگریٹ کو اپنے بیگ میں ڈال کر سکول لے آئی۔ روزی آج پھر سکول نہیں آئی تھی اور کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔ مارگریٹ بیگ کی کھلی زپ سے سر نکالے حیرت سے ہر چیز کو دیکھتی رہی۔

''سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔ یہ عمارت پہلے تو ایسی نہیں تھی۔'' وہ پچاس سال بعد اپنا سکول دیکھ رہی تھی۔ ایما اسے سکول میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں بتانے لگی۔ اسی وقت سامنے سے مس کیتھرین آتی دکھائی دیں۔ وہ انہیں گڈ مارننگ کہہ کر گزرنے لگی تھی جب اچانک مس کیتھرین کی نظر اس کے بیگ کی کھلی زپ میں سے جھانکتی گڑیا پر پڑی۔

''یہ۔۔۔ یہ کیا؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''مس! یہ میری گڑیا ہے۔ میں بس اسے اپنے دوستوں کو دکھانے سکول لائی تھی۔'' ایما کو ڈر تھا کہ کہیں وہ اس کی گڑیا ضبط نہ کر لیں۔

''مجھے لگا جیسے اس کی شکل کسی سے بہت ملتی ہے۔'' ان کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

''کیتھی! مس کیتھرین کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی مارگریٹ چلائی۔

''کیا؟'' ایما نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ابھی تم جس سے بات کر رہی تھی، یہ کیتھی ہے۔ کیتھرین سکول کے زمانے میں یہ میری بہترین دوست تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ وہ آج اسی سکول میں ٹیچر ہے۔ ہاں، وہ ہمیشہ سے ٹیچر ہی بننا چاہتی تھی۔''

اب ایما کو کچھ امید نظر آنے لگی۔ وہ مس کیتھرین کو پلان میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

ساری صورتحال جاننے کے بعد مس کیتھرین کتنی ہی دیر سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ انہیں نارمل ہونے میں کچھ وقت لگا۔ اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تو تینوں سر جوڑ کر اس کا حل تلاش کرنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ جس شخص نے مارگریٹ پر جادو کیا تھا، اب وہی اس کے اثر کو ختم کر سکتا تھا۔ اگلے روز ویک اینڈ تھا۔ طے پایا کہ مس کیتھرین دونوں کو صبح نو بجے لینے آئیں گی اور وہ تینوں اسی علاقے میں بڑھیا کی تلاش کریں گے۔

لیکن اگلے روز وہ نہ آئیں۔ دس بجے تک وہ دونوں ان کا انتظار کرتی رہیں اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ گئیں۔ ان سے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ ایما کو طرح طرح کے وہم ستانے لگے۔ پہلے روزی اور اب مس کیتھرین۔۔

مارگریٹ کی امید ٹوٹنے لگی تھی۔ اسے مایوس ہوتا دیکھ کر ایما نے خود کچھ کرنے کی ٹھانی۔ بس میں بیٹھ کر وہ اسی علاقے میں آ گئی جہاں کبھی وہ بڑھیا رہا کرتی تھی۔ علاقہ کافی حد تک آباد ہو چکا تھا۔ مارگریٹ کو وہ گھر پہچاننے میں دقت ہو رہی تھی جہاں اس نے بڑھیا کو دیکھا تھا۔ اچانک دونوں کو اپنے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔

''میرے پیچھے آؤ!'' ایک لڑکا انہیں ساتھ لیے ایک ایسے گھر تک آ گیا جو کافی حد تک بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے انہیں دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر کافی اندھیرا تھا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' ایک سرد نسوانی آواز سنائی دی۔ مارگریٹ پر شدید خوف طاری ہو گیا۔ یہ وہی جادوگرنی تھی جس نے اسے اس حال میں پہنچایا تھا۔

''تم وہی لڑکی ہو نا جو اس دن میری جاسوسی کر رہی تھی؟ لگتا ہے تم نے ابھی تک سبق نہیں سیکھا۔''

''دیکھیے! ہم بالکل بھی آپ کو تنگ کرنے نہیں آئے۔ مارگریٹ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے۔ اسے اپنی غلطی کی سزا مل چکی ہے۔ کیا آپ اسے واپس اس کی اصلی حالت میں لا سکتی ہیں؟'' ایما نے ڈرتے ڈرتے اپنا مدعا بیان کیا۔ بڑھیا کچھ دیر اسے گھورتی رہی جیسے جانچنے کی کوشش کر رہی ہو کہ آیا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے یا نہیں۔

"اگر تم واقعی سچ کہہ رہی ہو تو جاؤ اور انتظار کرو۔" اس نے ایما کو وہاں سے جانے کا عندیہ دیا۔

''لیکن میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ میری بیسٹ فرینڈ اور ٹیچر اچانک غائب ہوگئی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی اس جادو کی زد میں آ گئی ہیں؟''

''کبھی کچھ ایسا بھی ہو جاتا ہے جس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔'' بڑھیا کا لہجہ عجیب سا تھا۔ واپسی پر ایما بہت گم صم تھی۔ بس میں بیٹھ کر اس نے مارگریٹ کو اپنے ساتھ خالی سیٹ پر بٹھا دیا۔ گہری سوچ میں گم وہ اردگرد سے بے نیاز تھی۔ جب بس رکی تو اس کا دھیان مارگریٹ کی طرف گیا۔ لیکن یہ کیا؟ وہاں ایک ساٹھ سال کی عورت براجمان تھی۔ مارگریٹ واپس آ چکی تھی۔ وہی آنکھیں، وہی نقوش۔ خوشی سے بے حال وہ فوراً اپنے گھر جانا چاہتی تھی جہاں اور کوئی نہیں تو کم از کم اس کی بہن تو ضرور ہوگی۔ ایما کو جہاں اپنی دوست کے دور جانے کی اداسی تھی وہیں اس کے واپس اپنے گھر والوں سے ملنے کی خوشی بھی تھی۔ اسے وہیں چھوڑ کر وہ خود گھر واپس آ گئی۔ حسب توقع ممی اس پر برسنے لگیں۔ اس نے پہلے کبھی انہیں اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

''پچاس سال پہلے پراسرار طور پر غائب ہونے والی مارگریٹ مائیکل اچانک واپس آ گئیں۔'' اگلے روز کے اخبار کی شہ سرخی نے سب کو حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مارگریٹ کے گھر کے باہر رپورٹرز کا تانتا بندھا تھا۔ ایما ممی کو سارے معاملے سے آگاہ کر چکی تھی۔ پولیس بڑھیا کی تلاش میں تھی۔ وہ انہیں اور بھی کئی کیسز میں مطلوب تھی۔ پراسرار طور پر غائب ہونے والے اور بھی بہت سے لوگوں کے کیسز دوبارہ کھل چکے تھے۔ روزی اور مس کیتھرین سے ابھی تک اس کا کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اب تک اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ دونوں مارگریٹ کی مدد کرنے کی وجہ سے جادو کے اثر میں آ گئیں تھیں۔ وہ خوش قسمت تھی کہ بچ گئی۔

''ممی، میں ان سارے واقعات پر ایک کہانی لکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہے، میں یہ کہانی شائع کروانے میں تمہاری مدد کروں گی۔''

وہ کہانی لکھنے بیٹھی ہی تھی جب دروازے پر بیل بجی۔ سامنے روزی کھڑی تھی۔

''اتنے دن تم کہاں رہی؟'' وہ بھاگ کر اس کے گلے لگ گئی۔

''دراصل گرینی کی طبیعت کافی خراب ہوگئی تھی۔ تو ہمیں انہیں لے کر شہر سے باہر جانا پڑا۔ جلدی میں ہم کسی کو اطلاع بھی نہ دے سکے۔ لیکن وہاں ایک عجیب بات ہوئی۔ درمیان کے چند دن مجھے بالکل بھی یاد نہیں۔''

ایما اور روزی کو کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ روزی کے ساتھ اصل میں کیا معاملہ پیش آیا تھا اور نہ ہی مس کیتھرین کی کوئی خبر مل سکی۔ ☆

بقیہ: قبرستان کا بھوت

یہاں پھینک گیا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور چلنے لگا۔ مگر ابھی تھوڑا ہی راستہ طے ہوا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ بچے کا وزن بڑھ رہا ہے۔ دوبارہ اسے اپنا وہم سمجھ کر وہ چلنے لگا۔ مگر اب تو بچے کا وزن ہی نہیں بلکہ اس کے ہاتھ بھی ریحان کی گردن کے گرد اس طرح لپٹ چکے تھے کہ ریحان کا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ بچے کا چہرہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اسے جتنی آیات اور دعائیں یاد تھیں، وہ پڑھنے لگا اور خود کو بچے سے چھڑوانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے وہ قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا اس بھیانک مخلوق کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ریحان نے اسے اپنی گود سے اٹھا کر نیچے زمین پر پھینک دیا اور خود دوڑ لگا دی۔ اسے اپنے پیچھے اسی بھیانک مخلوق کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی:

''خوش قسمت ہو جو میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گئے۔ ورنہ جو بھی میرے ہاتھ آیا ہے وہ کبھی بچ کر نہیں جا سکا۔''

قرآنی آیات کے دم کے کچھ دنوں بعد ریحان کی حالت ٹھیک ہو گئی مگر اس نے توبہ کر لی کہ آئندہ کبھی رات کے وقت اس قبرستان سے نہیں گزرے گا۔ ☆

بقیہ: جادوئی ہاتھ

''یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟ تمہیں کس کام سے بھیجا تھا اور تم کر کیا رہے ہو؟''

میں غصے سے چلایا۔ ہاتھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مگن تھے۔ گیند جھاڑیوں میں جا پھنسی ہاتھ اسی جوش کے ساتھ آگے بڑھے اور گیند نکالنے کی سعی کرنے لگے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے جھاڑیوں میں ہاتھوں کی تاریں ایسی الجھی کے سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں، پھر اُن تاروں میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں چیخنے لگا مگر میرے ہاتھ تو ان دستانوں میں مقید تھے۔ میں بے بسی کی انتہا پر تھا کچھ نہیں کر سکتا تھا اور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا کہ ان جادوئی ہاتھوں کو آگ لگ گئی تو میرے ہاتھ بھی جل جائیں گے اور میں عمر بھر کے لیے معذور ہو جاؤں گا۔ سوچ کر ہی دل دہل سا گیا تھا۔ بچے منظر سے گدھے کے سر پر سینگ کے مصداق غائب ہو چکے تھے، میں مدد کے لیے پکارتا رہا مگر وہاں کوئی ہوتا تو میری طرف آتا نا۔

''کیا ہوا بیٹا؟''

ابا جی نے میرا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''اوہ! تو یہ خواب تھا۔''

خود کو اپنے کمرے میں پایا تو اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ اس نے ہمیں کام کاج کرنے کو بہت خوب ہاتھ دے رکھے ہیں، مجھے بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ ان جادوئی ہاتھوں کی خواہش جو بچپن سے میرے دل میں پنپ رہی تھی، فضول تھی، میں انجانے میں رب کی ناشکری کر رہا تھا۔ ☆

آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ بچہ اسی نے اغوا کیا ہے؟

سامنے میز کی کرسی پر انسپکٹر صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے گرد بڑی کرسیوں پر سالار صاحب اور ان کے گھر کے افراد کے ساتھ چند محلے والے بھی تھے۔ وہ سب اسفند کے جواب کے منتظر تھے۔

☆

رات کا دوسرا پہر تھا۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی کھلے دریچوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی اور کمرے میں مکمل تاریکی ہونے سے روک رہی تھی۔ اسفند اپنے بستر میں بے چین سا لیٹا تھا۔ عجیب سی بے چینی اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ اسفند ہمیشہ کی طرح رات کو نو بجے سو گیا تھا۔ مگر رات کے پونے بارہ بجے اس کی آنکھ ایک بھکاری کی آواز پر کھلی۔ بھکاری ایک مخصوص انداز میں مدد کی صدائیں لگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بھکاری کی آواز پہلے ہلکی اور پھر گم ہو گئی۔ مگر اسفند کے دماغ سے وہ غائب نہ ہوا۔ اسفند کے دماغ میں عجیب وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ (ابھی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ وہی صدائیں سنسان گلی) اس نے اپنے برابر میں لیٹے بڑے بھائی کو کندھے سے ہلاتے ہوئے کہا:

''کیا ہوا منّے کو ڈر لگ رہا ہے؟''

فہد بھائی نے اسفند کو چڑانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں بھائی! یہ بات نہیں ہے۔'' فہد بھائی نے اس بار آنکھیں کھولتے ہوئے اسفند سے کہا۔ ''آدھی رات کو تمہیں کونسی بات یاد آ گئی ہے؟''

''بھائی! باہر گلی میں کوئی بھکاری اس وقت آیا ہے۔'' اسفند نے ''اس وقت'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ ہمارے محلے میں 10 بجے کے بعد بھکاری تو دور کوئی سواری تک نہیں گزرتی۔ اگر بھائی! وہ کسی غلط مقصد کے لیے.....''

فہد بھائی نے اسفند کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اپنے جذبات کو کنٹرول کرو اسفند! ہو سکتا ہے وہ بہت مجبور ہو اس لیے رات کے اس پہر آیا ہے۔''

''لیکن بھائی!''

فہد بھائی نے دوبارہ اسفند کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

اگر یہ ملیحہ باجی جاگ گئی نا تو تم ہی لیکچر سننا ان کے فہد بھائی نے دوسرے بیڈ پر سوئی اپنی بڑی بہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں کیوں جاگ رہے ہو؟ خیر ہے؟ صبح اسکول بھی جانا ہے۔'' ملیحہ آپی نے ایک ہی سانس میں تین جملے کہے۔ وہ اپنے بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''لو جی! آپ بھی اُٹھ گئیں۔ پہلے اسفند کم تھا۔'' فہد بھائی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ ان کی کمر اب اسفند کی طرف تھی۔

''اب اگر تم دونوں میں سے کسی کی بھی آواز آئی نا تو میں نے امّی اور ابّو کو بلا لانا ہے۔'' ملیحہ آپی نے دھمکاتے ہوئے کہا۔ ''رات کے بارہ بجے پتا نہیں کون سی کہانیاں کھول کر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' ملیحہ آپی بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ لیٹ گئیں۔ ڈھول بجنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ ان کی پچھلی گلی میں شادی تھی۔ اسفند کی بند آنکھیں ڈھول کے ساتھ شامل ہونیوالی مزید آوازوں پر دوبارہ کھل گئیں۔

☆

فاطمہ عابد

ڈھونگی بھکاری

''ابو جان کیا ہوا؟ آج آپ کچھ پریشان ہیں۔'' اسکول سے باہر نکلتے ہی ملیحہ آپی نے ابو کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔ ابو جان نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا:

ہاں بیٹا! گاڑی میں بیٹھ کر اسفند مبین نے کہا۔ ''کیوں ابو؟''

''بیٹا دراصل سالار صاحب جن کے گھر کل شادی تھی ان کے بیٹے سہیل کا اکلوتا بیٹا موسیٰ سہیل کل رات سے گم ہے۔ پولیس اب تک اسے ڈھونڈ رہی ہے۔'' مبین صاحب نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔ ''کس وقت؟'' اسفند نے بے توقف پوچھا۔ پونے بارہ سے سوا بارہ کے درمیان مبین صاحب نے حیرت سے اسفند کو جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں اسے۔'' اسفند نے کہا۔ کیسے؟ مبین صاحب نے پوچھا۔

''اغوا کار کو۔'' اسفند بولا۔

مبین صاحب، ملیحہ آپی اور فہد بھائی نے بیک وقت چونک کر اسفند کو دیکھا۔

☆

اسکول سے واپسی پر اسفند کے ابو نے فوراً سالار صاحب کو کال کر کے اس بھکاری پر شک ظاہر کیا۔ پولیس نے اس علاقے کے تمام بھکاریوں کو جمع کر لیا۔ اس میں سے ایک بھکاری جو نہایت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر سالار صاحب کو فوراً یاد آ گیا کہ اسی بھکاری کو رات بارہ بجے دیکھ کر انہوں نے سوچا تھا کہ یہ کس قدر مجبور ہوگا جو اب آیا ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے اس بھکاری کو شادی پر کھانا کھلایا اور پیسے بھی دیئے تھے۔ پولیس نے اس سے تفتیش شروع کر دی۔ اگلے چھے گھنٹوں بعد سالار صاحب کا پوتا موسیٰ ان کے گھر پر موجود تھا۔

☆

اس فقیر نے اقرار جرم کر لیا تھا۔ وہ ایک گینگ کا ممبر تھا جو بچوں کو اغوا کر کے فروخت کرتے تھے۔ وہ موسیٰ سہیل کو بھی کراچی بھجوا رہے تھے مگر اسفند کی نشاندہی سے موسیٰ کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے بچے بھی بچ گئے تھے۔ مگر سب کو اس بات کا تجسس تھا کہ آخر اسفند کو اس بھکاری پر شک کیوں ہوا؟

☆

اسفند مبین اپنے بھائی اور ابو کے ساتھ سالار صاحب کے گھر پر موجود تھا۔ جہاں موسیٰ کے مل جانے پر ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ انسپکٹر صاحب سامنے میز کی کرسی پر براجمان تھے۔ ان کی ساتھ والی کرسیوں پر سالار صاحب کے گھر کے چند افراد اور محلے والے بھی تھے۔ اسفند اس وقت سب کی نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

''دراصل رات کے پونے بارہ بجے میں اس بھکاری کی صداؤں پر جاگ گیا۔ مجھے فقیر کا اس وقت آنا کچھ مشکوک لگا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت مجبور ہو۔ لیکن جب وہ فقیر گلی سے گزر گیا تو پانچ منٹ بعد ایک موٹر سائیکل تیزی سے گزری اور اس موٹر سائیکل کے گزرنے کے وقت فقیر کی صدائیں پھر آنا شروع ہوئیں۔ فقیر دوبارہ ہماری گلی میں آ چکا تھا۔ فقیر کی آواز ابھی مکمل طور پر گم نہ ہوئی تھی کہ وہی موٹر سائیکل دوبارہ برق رفتاری سے گزری۔ ان سب آوازوں میں ایک بچے کی آواز کا اضافہ ہوا۔ شاید وہ رو رہا تھا یا چلا رہا تھا، مگر پانچ سیکنڈ بعد بچے سمیت وہ موٹر سائیکل ہماری گلی سے جا چکی تھی۔ یہ سب ایک اتفاق نہیں ہو سکتا تھا مگر میں دعائیں کرتا رہا کہ یہ سب ایک اتفاق ہو۔'' مگر افسوس! یہ اتفاق نہ ہوا۔ اسفند تفصیل سے بتا رہا تھا۔

''دراصل فقیر ہماری گلی سے ہونے کے بعد آپ کی گلی میں آیا اور پھر ہو سکتا ہے اس نے اپنے Gang کو فون کیا ہو کہ فلاں شادی پر فلاں بچہ ہے اور پھر وہ فقیر ہماری گلی میں آ گیا تا کہ وہ یہ کہہ سکے کہ اغوا کے وقت وہاں موجود نہ تھا اور پھر اس کے Gang نے کام پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔'' اسفند بات مکمل کر چکا تھا۔ وہاں موجود سب لوگ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کی بات سن رہے تھے۔ اس کی بات مکمل ہونے پر انسپکٹر صاحب نے ستائشی نشروں سے مبین صاحب اور پھر اسفند کو دیکھا۔

''بہت ذہین ہو تم بیٹا! ماشاءاللہ'' اسفند انسپکٹر صاحب کی تعریف پر جھینپا۔ مبین صاحب بھی مسکرائے۔ ''تمہاری نشاندہی سے ہی ہم اس Gang کو پکڑنے میں کامیاب ہوئے۔ ان ڈھونگی بھکاریوں کی وجہ سے معاشرے کے ضرورت مند بھکاریوں کو بھی برا سمجھا جاتا ہے اور ضرورت مند بھکاریوں پر بھی شک کیا جاتا ہے اور وہ مدد سے بھی محروم رہتے ہیں۔'' انسپکٹر صاحب نے بے چارگی اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

''مگر ہم ضرورت مند بھکاریوں کو کیسے پہچان سکتے ہیں۔'' اسفند نے الجھی نظروں سے انسپکٹر صاحب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ان ڈھونگی بھکاریوں کی وجہ سے ضرورت مند بھکاریوں کی شناخت بہت مشکل ہو گئی ہے۔ معاشرے کو اسفند جیسے ذہین لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو پولیس کو ان ڈھونگی بھکاریوں کو پکڑنے میں مدد کریں۔'' انسپکٹر صاحب نے آخری جملہ اسفند کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ فہد بھائی نے انسپکٹر صاحب کو جواب میں کہا:

''بالکل! اگر ہم معاشرے سے ڈھونگی بھکاریوں کا خاتمہ کر دیں تو اصل بھکاریوں کی شناخت نہایت آسان ہو جائے گی۔'' ''بالکل!'' سب نے مل کر کہا۔ اسفند کو سب سے خوب داد اور دعائیں ملیں۔ سالار صاحب کے گھر سے نکلتے ہوئے فہد بھائی نے کہا:

''لگتا ہے میری دعا پوری ہو گئی اسفند۔'' اسفند نے چونک کر انہیں دیکھا اور پوچھا:

''کیا؟''

اللہ نے تمہیں عقل دے دی۔ ''بھائی!'' اسفند نے احتجاجاً کہا۔ مبین صاحب نے اسفند کے کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا:

''شاباش بیٹا! مجھے تم پر فخر ہے۔'' وہ تینوں اپنے گھر کی طرف گامزن تھے۔☆

چڑیا گھر

محمد نذیر مرزا

بچے، بوڑھے سارے جائیں چڑیا گھر
آؤ مل کر موج منائیں چڑیا گھر

ہاتھی، شیر، مگرمچھ، سانپ اور ریچھ ملیں
ڈرتے ڈرتے بچے جائیں چڑیا گھر

پنجرے میں اِک ناچتا مور نظر آئے
بندر اپنا کھیل دکھائیں چڑیا گھر

چڑیا، طوطے، فاختہ اور کبوتر بھی
اپنے اپنے گیت سنائیں چڑیا گھر

گھر سے برگر اور سموسے لے جائیں
لڈو، برفی، پیڑے کھائیں چڑیا گھر

بولی ہم بھی سیکھیں پیار محبت کی
دل کرتا ہے آئیں جائیں چڑیا گھر

لکڑہارا اور دیو

نظیر فاطمہ

پرانے زمانے کی بات ہے کسی ملک پر ایک رحم دل اور عادل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ اپنے عوام کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کا ملک اور یہاں کے لوگ بہت خوش حال تھے۔ کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ زراعت، صنعت اور تجارت خوب پھل پھول چکی تھی ہر طرف امن و سکون تھا۔ پڑوسی ممالک سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مگر کچھ عرصے سے بادشاہ اور اس کے عوام بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کی پریشانی کی وجہ ایک ظالم دیو تھا۔ جی ہاں۔ ایک ظالم دیو جو ہر مہینے چاند کی ۱۷ تاریخ کو رات کے وقت آتا اور دارالحکومت سے ایک نوجوان لڑکے کو اُٹھا کر لے جاتا اور جاتے جاتے وہ کسی دوسرے گھر کے دروازے پر نشان لگا دیتا۔ اس نشان کا مطلب یہ تھا کہ اگلے مہینے وہ اس گھر سے لڑکا لے کر جائے گا۔

دیو جو بہت خوف ناک اور طاقت ور تھا۔ اس کی شکل بے حد ڈراؤنی تھی۔ لمبے لمبے نوکیلے دانت منہ سے باہر تھوڑی کو چھوتے تھے۔ اس کا قد اور جسامت پہاڑ جیسی تھی۔ اس کا بدن اتنا مضبوط تھا کہ اس پر کوئی تلوار یا تیر اثر نہیں کرتا تھا۔ بادشاہ نے یہ اعلان کروا رکھا تھا کہ جو کوئی اس دیو کو مارے گا اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ مگر کوئی بھی اس دیو کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کوئی اسے مارنے آتا تو اسے اپنے پیروں کے نیچے کچل دیتا تھا۔ چاند کی ۱۷ تاریخ کو لوگ سرِ شام ہی اپنے گھروں میں قید ہو جاتے۔ مگر پھر بھی وہ مطلوبہ گھر سے لڑکا اُٹھا کر لے جاتا۔ لوگوں کی پریشانی اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ بادشاہ کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے لوگوں کو پریشان دیکھ کر خود بھی بڑا پریشان اور غمگین تھا۔ آخر بادشاہ نے یہ اعلان کروا دیا کہ جو کوئی اس دیو کو مارے گا اسے انعام و اکرام کے ساتھ ساتھ سلطنت کی سب سے بڑی ریاست کا والی بنا دیا جائے گا۔

بادشاہ کی سلطنت کے ایک دور دراز گاؤں میں ایک لکڑہارا رہتا تھا جو بہت غریب تھا۔ وہ اپنی غربت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس تک جب بادشاہ کا یہ اعلان پہنچا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس دیو کو ضرور مارے گا۔ اس نے اس بات کا تذکرہ اپنی بیوی سے کیا تو وہ کہنے لگی: ”تم جانتے ہو یہ آسان کام نہیں ہے، کیوں اپنی جان گنوانا چاہتے ہو۔“

”اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں ایک کوشش تو ضرور کروں گا۔ شاید ہمارے حالات بدل جائیں۔“ لکڑہارے نے پرعزم لہجے میں کہا۔

”بدل ہی نہ جائیں کہیں۔“ اس کی بیوی نے طنز سے کہا۔

لکڑہارے کو سب نے سمجھایا مگر وہ کسی صورت نہ مانا اور جانے کی تیاری کر لی۔

لکڑہارے کے پاس یہ نایاب فن تھا کہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتا تھا۔

.....☆.....

لکڑہارا سفر پر نکلا۔ سفر بے حد کٹھن تھا۔ چلتے چلتے کئی ہفتے گزر گئے مگر ابھی تک وہ بادشاہ کے محل تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایک مہینے کے سفر کے بعد وہ ایک جنگل میں پہنچا۔ اس جنگل سے باہر نکل کر دو دن کی مسافت پر بادشاہ کا محل تھا۔ لکڑہارا بہت تھک چکا تھا۔ اس نے سوچا کچھ دیر آرام کرلے۔ وہ کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ اس کی نظر ایک گھنے درخت کی سب سے نچلی ٹہنی پر پڑی جو بہت موٹی اور قدرے چوڑی تھی۔

''اس پر تو میں آرام سے لیٹ سکتا ہوں۔'' لکڑہارے نے سوچا اور جا کر اس پر لیٹ گیا۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دو بدبد آ کر اس درخت کی قدرے اُوپر والی شاخ پر بیٹھ گئے۔ دونوں بدبد آپس میں باتیں کرنے لگے۔ لکڑہارا ان کی باتیں سننے لگا۔

''آج تو میں تھک گیا ہوں۔'' ایک بدبد بولا۔

''وہ کیوں؟ آج ایسا کیا کیا تم نے جو تھک گئے ہو؟'' دوسرا بدبد بولا۔

''میں آج بادشاہ کے محل میں گیا تھا۔'' پہلا بدبد بولا۔

''اچھا، اچھا۔۔ پھر تو واقعی تم نے بڑا لمبا سفر کیا آج'' دوسرے بدبد نے سر ہلایا۔

''بادشاہ بہت پریشان تھا بلکہ دارالحکومت کے سارے ہی لوگ بہت پریشان تھے۔'' پہلے بدبد نے افسوس سے کہا۔

''وہ کیوں؟'' دوسرا بدبد حیرت سے بولا۔

''تمہیں ابھی تک پتا نہیں چلا کہ دارالحکومت میں چاند کی ۱۷ تاریخ کو ایک ظالم دیو آتا ہے اور ایک لڑکے کو اُٹھا کر لے جاتا ہے اور پھر کسی گھر کے دروازے پر نشان لگا دیتا ہے اگلی بار وہ اس گھر سے لڑکا لے جاتا ہے۔'' پہلے بدبد نے قدرے تفصیل بتائی۔

''ہاں میں نے سنا تو تھا اس بارے میں مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ معاملہ اتنا سنجیدہ ہے۔'' دوسرے بدبد نے کہا۔

''اس دفعہ وہ بادشاہ کے محل کے گھر کے دروازے پر نشان لگا گیا ہے۔ بادشاہ اور ملکہ بہت پریشان ہیں۔ تین دن بعد چاند کی ۱۷ تاریخ ہے وہ آئے گا اور شہزادے کو اُٹھا کر لے جائے گا۔ انعام کے لیے کئی لوگوں نے اس دیو کو مارنے کی کوشش کی مگر خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔'' پہلے بدبد نے بتایا۔

''تو اسے مارنے کا کوئی تو طریقہ ہوگا؟'' دوسرے بدبد کا دل دکھ سے بھر گیا تو وہ ہلکی سے آواز میں پوچھنے لگا۔

''ہاں! اسے مارنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔'' پہلے بدبد نے کہا۔

''وہ کیا؟'' دوسرے بدبد نے پوچھا۔

لکڑہارا جواب تک ان کی بات چیت غیر ارادی طور پر سن رہا تھا، فوراً اُٹھ بیٹھا اور ان کی باتوں کو غور اور توجہ سے سننے لگا۔

''اگر یہ دیو کسی آئینے میں اپنی شکل دیکھ لے تو اس کا وجود راکھ کا ڈھیر بن جائے گا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔''

یہ بات سن کر لکڑہارا جوش سے چیخ مار کر کھڑا ہوا تو دونوں پرندے ڈر کر اُڑ گئے۔

.....☆.....

لکڑہارے نے دوبارہ اپنا سفر شروع کیا اور دو دن مسلسل چلنے کے بعد شام کے وقت لکڑہارا بادشاہ کے محل کے باہر پہنچ گیا۔ محل کا دروازہ بہت بڑا تھا۔ لکڑی کے اس دروازے پر بڑے خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ لکڑی کا دروازہ اتنا دبیز، مضبوط تھا کہ کسی آہنی دیوار سے کم نہ ہوگا۔ لکڑہارا سر اُٹھا کر دروازے کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ دروازے پر دربان کھڑے تھے۔ لکڑہارا ان کی طرف بڑھا۔

''میں بادشاہ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' لکڑہارے نے ایک دربان سے کہا۔

''کس سلسلے میں ملنا ہے نوجوان'' دربان نے پوچھا۔

''میں ظالم دیو کو مارنے آیا ہوں۔'' دربان نے یہ بات سن کر اسے نیچے سے اُوپر تک دیکھا۔

''بڑے بڑے بہادر اور طاقت ور نوجوان اس دیو کا مقابلہ نہیں کر سکے تو تم اسے کیسے مارو گے؟'' دربان نے دبلے پتلے لکڑہارے کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''مجھے دیو کو مارنے کا طریقہ معلوم ہے اور اس طریقے پر عمل کرنے کے لیے عقل اور ہوشیاری کی ضرورت ہے جسمانی طاقت کی نہیں۔۔ تم مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔'' لکڑہارے نے مسکرا کر کہا۔ چنانچہ وہ دربان لکڑہارے کو بادشاہ کے پاس لے گیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر براجمان تھا اور کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''آداب بادشاہ سلامت!'' بادشاہ نے چونک کر دیکھا اور لکڑہارے کے آداب کا سر کے اشارے سے جواب دیا۔ ''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''بادشاہ سلامت! میں ایک غریب لکڑہارا ہوں۔ میں اس ظالم دیو کو مارنے کا طریقہ جانتا ہوں جو دارالحکومت سے لڑکوں کو اُٹھا کر لے جاتا ہے۔''

لکڑہارے نے مودب انداز میں کہا۔ لکڑہارے کی بات سن کر بادشاہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا؟؟؟؟ جلدی بتاؤ، وہ طریقہ کیا ہے؟'' بادشاہ نے بے تابی سے پوچھا۔ اتنے میں ملکہ بھی وہاں چلی آئی اور خاموشی سے دونوں کی باتیں سننے لگی۔

''بادشاہ سلامت! اگر وہ دیو اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ لے تو جل کر بھسم ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔'' لکڑہارے نے بتایا۔ بادشاہ کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ اتنا ظالم دیو اتنی آسانی سے مر جائے۔'' بادشاہ نے پوچھا۔

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے بادشاہ سلامت، جتنا نظر آ رہا ہے۔ اس کے لیے بڑی ہوشیاری اور پھرتی کی ضرورت ہے۔ ورنہ جان جانے کا خطرہ ہے۔ اگر دیو کو بھنک بھی پڑ گئی کہ

اسے آئینہ دکھایا جائے گا تو وہ غضب میں آ کر بہت تباہی پھیلائے گا۔'' لکڑہارے نے کہا۔

''یہ کام کون کرے گا؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''طریقہ میں نے بتایا ہے تو میں ہی کروں گا، حضور'' لکڑہارے نے ادب سے کہا۔

''جہاں پناہ، میرا خیال ہے اس آدمی کو ایک موقع دے دینا چاہیے، کیا پتا ہمیں واقعی اس ظالم دیو سے نجات مل جائے۔'' ملکہ نے مشورہ دیا تو بادشاہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بادشاہ نے زور سے تالی بجائی تو ایک خادم حاضر ہوا۔

''اس آدمی کو منتظم اعلیٰ کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو جیسا یہ کہے ویسے انتظامات کر دیے جائیں۔'' خادم جھک کر تعظیم بجالایا اور لکڑہارے کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ لکڑہارے نے سارے انتظامات اپنی نگرانی میں مکمل کروائے۔

☆

چاند کی ۱۷ تاریخ تھی۔ محل میں موت کا سا سناٹا تھا۔ شہزادہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا۔ سب بہت پریشان تھے کہ آج دیو اس کو لے جائے گا۔ ملکہ تو باقاعدہ اُونچی آواز میں رو رہی تھی۔ دیو کے آنے کا وقت ہو گیا۔ خاموشی پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی۔ دیو کے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ لوگوں اپنے گھروں میں سہم کر رہ گئے۔ ظالم دیو اپنے آپ میں مست محل کے صدر دروازے پر پہنچا اور ایسا زوردار ہاتھ مارا کہ دروازہ ٹوٹ کر اندر جا گرا۔ بادشاہ دیو کو دیکھ کر زرد پڑ گیا۔ دیو زور زور سے قہقہے لگاتا شہزادے کے کمرے کی طرف بڑھا۔ بادشاہ اور ملکہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ شہزادے کے کمرے کے دروازے پر جا کر دیو رُک گیا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ اندر کمرے میں شہزادہ تھر تھر کانپتے ہوئے سسکیوں سے رونے لگا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور اس پر باہر کی جانب ایک موٹا سا پردہ یوں لٹک رہا تھا کہ پورے کا پورا دروازہ اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ جوں ہی دیو نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑے لکڑہارے نے فوراً پردہ سمیٹ کر ایک سائیڈ پر کر دیا۔ سامنے پورے دروازے جتنا آئینہ تھا۔ دیو کی نظر سیدھی آئینے پر جا پڑی۔ جیسے ہی اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا، زور زور سے چیخنے لگا۔

''ہٹاؤ، اسے میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔'' وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے غیض سے گویا ہوا۔ مگر چند لمحوں میں اسے آگ لگ گئی وہ باہر کی جانب دوڑا مگر صدر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی جل کر بھسم ہو گیا۔

بادشاہ اور ملکہ نے دوڑ کر شہزادے کو پکڑا۔ ہر طرف شادیانے بجنے لگے۔ بادشاہ نے لکڑہارے کو گلے سے لگا لیا۔

اگلی صبح بادشاہ نے اسے سلطنت کی سب سے بڑی ریاست کا والی بنا دیا۔ لکڑہارے نے اپنے بیوی بچوں کو بھی وہاں بلا لیا اور ریاست کا انتظام و انصرام اچھے طریقے سے چلانے لگا۔☆

بقیہ: 20 فروری

کر وہاں پہنچ گیا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو تم دونوں وہاں بے ہوش پڑی تھیں۔ باقی بات میں تمہیں بہت جلد بتا دوں گا۔''

کچھ دنوں میں وہ دونوں صحت یاب ہو گئیں تو ڈیوڈ ان دونوں کو اسی قبرستان میں لے کر گیا جہاں مارتھا کی گاڑی خراب ہوئی تھی۔

''ان دونوں قبروں کو دیکھو!'' ڈیوڈ نے دو قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں قریب جا کر قبروں کے کتبوں پر لکھے نام پڑھنے لگیں۔ دائیں طرف والی قبر لورین جوزف کی تھی۔

تاریخ پیدائش: (15 اپریل 1945)

تاریخ وفات: (1 مارچ 1990)

اس کے بائیں طرف والی قبر کیتھرین جوزف کی تھی۔

تاریخ پیدائش: (6 اکتوبر 1974)

تاریخ وفات: (20 فروری 1990)

یہ دیکھ کر ان دونوں کے چہروں پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔

''یہ دونوں اتنے سال پہلے مر چکیں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ جن سے ہم ملے وہ دونوں روحیں تھیں؟'' جولیا حیرت سے بولی۔

''ہاں وہ دونوں روحیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ کیتھرین پر کسی بدروح نے قبضہ کر لیا تھا اور اسی نے اپنی ماں لورین جوزف کو بھی مارا تھا۔ لورین بھی مرنے کے بعد ایک بدروح بن گئی تھی۔ ہر سال بیس فروری کو وہ اسی طرح کسی نہ کسی کو وہاں بلاتیں ہیں اور اس کا خون پیتی ہیں۔ تم دونوں خوش قسمت ہو جو زندہ بچ گئیں، ورنہ آج تک نجانے وہاں کتنے ہی لوگ گئے اور کبھی واپس نہیں آئے۔'' ڈیوڈ نے انہیں بتایا تو وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگیں جس نے انہیں محفوظ رکھا۔ وہ تینوں قبرستان سے باہر نکلے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆

20 (فروری 2022)

ٹوں ٹوں ٹوں!

رات کے دو بجے فون کی بیل بجی تو پیرانارمل انویسٹیگیٹر ٹام نے فون اٹھایا۔

''جی میں لورین جوزف بول رہی ہوں۔ میری بیٹی کیتھرین جوزف پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ آپ پلیز میری مدد کریں۔''

''جی بالکل، آپ پلیز اپنا ایڈریس لکھوا دیں۔'' ٹام نے کہا۔ پھر وہ ایڈریس نوٹ کرنے لگا جو شہر سے سو کلومیٹر دور تھا۔

''وہ دونوں لڑکیاں تو بچ گئیں لیکن یہ نہیں بچ سکے گا۔'' لورین نے خوفناک قہقہہ لگایا تو کیتھرین بھی مسکرا دی۔ ☆

چھت کا معمہ

مصباح ناز

ماہی اپنے گھر اسکول کا کام کرنے میں مصروف تھی کہ دروازے کی بیل بجی۔ اُس کی امی نے دروازہ کھولا تو سامنے محلے دار ایک خاتون فردوس کھڑی تھی۔ ماہی نے فردوس آنٹی کو سلام کیا۔ ماہی کی امی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ آج وہ یہاں کیسے آ گئی کیونکہ فردوس آنٹی کے مزاج سے پورا محلہ واقف تھا۔ وہ جھگڑالو مزاج کی تھی اور کسی کے گھر آنا جانا بھی اتنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس سے پہلے کہ ماہی کی امی ان سے آنے کا سبب پوچھتی فردوس آنٹی بول پڑی، میں یہاں ماہی سے ملنے آئی ہوں۔

فردوس آنٹی کی اس بات پر ماہی اور اُس کی امی بہت حیران ہوئیں۔ ماہی کی امی نے انہیں بیٹھنے کا کہا اور ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ جبکہ آنٹی فردوس ماہی کے پاس آئی اور اسے کہا کہ کل وہ ساری ٹیم کھوجی کو لے کر میرے گھر آ جائے۔ اُن کی مدد کی ضرورت ہے۔ بس وہ اتنی بات کر کے وہاں سے چلی گئی۔ انہوں نے چائے بھی نہ پی۔

اگلے دن اسکول میں ماہی نے اپنی دوستوں ثانی اور دونوں جڑواں بہنوں میشا اور رابی کو معمے سے آگاہ کیا۔ اسی شام ٹیم کھوجی آنٹی فردوس کے گھر پہنچ گئی۔

آنٹی فردوس شاید اُن کی ہی راہ دیکھ رہی تھیں۔ لڑکیاں پہلے تو ہچکچا رہی تھی کیونکہ آنٹی فردوس کو بچے بالکل پسند نہیں تھے۔ اُن کے گھر کے باہر اگر کوئی بچہ کھیلتا تو فوراً اسے ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ محلے کے بچے بھی انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔

فردوس آنٹی نے بچیوں کو بیٹھنے کو کہا۔ وہ خاصی پریشان معلوم ہو رہی تھی۔ لڑکیاں کچھ بولتی کہ آنٹی بول پڑی۔ معمہ کچھ یوں تھا کہ آنٹی فردوس کے چھت پر کوئی بھوت آ گیا تھا یا نہ جانے کیا بلا تھی۔ ہر روز مغرب کے بعد انہیں اپنی چھت پر کوئی بھاری بھرکم قدم چلتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کافی خوفزدہ تھیں۔ ٹیم کھوجی کی لڑکیاں محلے کے اکثر چھوٹے موٹے کیس حل کرتی تھیں۔ بس یہ ہی سوچ کر آنٹی نے ان سے مدد مانگ لی۔ لڑکیوں نے خوشی خوشی آنٹی کی مدد کرنے کی حامی بھر لی۔ اب تحقیق کا وقت تھا۔

''یہ قدم مغرب کے بعد کتنی دیر تک سنائی دیتے ہیں؟'' میشا نے اپنے اندر کے جاسوس کو باہر لاتے ہوئے سوال کیا۔

''کم سے کم دس منٹ۔'' آنٹی نے جواب دیا۔

''اور ایسا کب سے ہو رہا ہے؟'' اب کی بار ماہی نے سوال کیا۔

''پچھلے ہفتے سے۔'' آنٹی بولی۔

''کیا آپ نے کبھی چھت پر جا کر نہیں دیکھا؟'' رابی نے کہا۔

''ارے بیٹا! جب پہلے دن میں نے آوازیں سنیں تو میں اوپر گئی تھی۔ پر میرے اوپر جانے تک آوازیں تھم گئی۔ میں تیز تیز تو اوپر جا نہیں سکتی۔ اب بوڑھی ہو گئی ہوں۔'' آنٹی نے وضاحت دی۔

''آپ فکر نہ کریں آج ہم یہاں رکتے ہیں اور اوپر جا کر دیکھیں گے کہ کیا معمہ ہے۔'' ماہی نے کہا تو میشا اور ثانی کا ڈر کے مارے حلق خشک ہونے لگا، کیونکہ وہ دونوں ہی بھوتوں سے بہت ڈرتی تھیں۔ آنٹی لڑکیوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنے کچن میں چلی گئی۔

''آخر یہ بھوت ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں۔ ہر کسی کیس میں بھوت آ جاتا ہے۔'' میشا نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے ہاتھ دھو کر نہیں نہا دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' ثانی نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ مغرب کی اذان ہونے لگی۔ اندھیرا پھیلتے ہی ماحول میں اور بھی خوف وہراس پیدا ہو گیا۔ اذان ابھی مکمل ختم نہ ہوئی تھی کہ چھت پر سے دھپ دھپ کی آوازیں آنے لگی۔ جیسے کوئی زور سے پاؤں مار رہا ہو۔ لڑکیاں بھی اوپر جانے سے کچھ گھبرا رہی تھیں۔ آنٹی بھی آوازیں سن کر کچن سے باہر آ گئی۔ سب مل کر اوپر گئے مگر اُن کے جانے تک بھوت جا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

''یہ معمہ یوں حل نہیں ہوگا۔'' رابی نے کہا۔

ہاں مجھے بھی لگتا ہے ہمیں کسی پیر بابا کی ضرورت ہوگی۔ یشا نے جھٹ سے کہا۔

''ارے انہیں بیوقوف! میرا مطلب ہے ہمیں چھت پر آنے میں وقت لگ جاتا ہے تب تک جو بھی ہوتا ہے وہ بھاگ جاتا ہے۔ ہمیں کوئی اور طریقہ اپنانا ہوگا۔'' رابی نے مزید وضاحت پیش کی۔

''ہاں میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ آنٹی کا گھر میرے گھر کے پاس ہے۔ تب ہی تو وہ مجھ سے مدد مانگنے آئیں۔ اگر ہماری ٹیم میرے گھر کی چھت پر چڑھ کر اس کا انتظار کریں تو دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کون کر رہا ہے، بھوت ہے یا کوئی اور معمہ۔'' ماہی نے اپنی تجویز پیش کی جو سب کو مناسب لگی۔

اب کل کا دن اس کام کے لیے طے پا گیا۔ کل اس بھوت نے دوبارہ آنا تھا۔ لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو جانے لگیں تو آنٹی نے انہیں روک لیا۔ پہلے کچھ کھانے کو دیا اور پھر انہیں گھر بھیجا۔ لڑکیاں آنٹی کا حسن سلوک دیکھ کر حیران سی رہ گئیں۔ کیونکہ وہ تو بڑی سخت مزاج تھیں۔

اگلی شام آنٹی فردوس اپنے گھر میں ہی تھی اور اُن کے ساتھ رابی اور ثانی بھی وہیں موجود تھیں۔ جبکہ یشا اور ماہی دوربین کے ساتھ آنٹی فردوس کے چھت پر نظر رکھے ہوئے تھیں۔ مغرب کی اذان شروع ہوئی تو لڑکیاں اور بھی چوکنا ہو گئیں۔ ماہی نے دوربین پر آنکھیں گاڑھ لیں۔ تب ہی انہوں نے دیکھا کے آنٹی فردوس کے ساتھ والے گھر کی چھت سے کوئی اُن کی چھت پر آیا ہے اور زور زور سے پاؤں مارتا بھاگ گیا ہے۔ اتنے اندھیرے میں اُس کا چہرہ دیکھنا مشکل تھا مگر یہ بات تو طے ہو گئی کہ یہ کوئی بھوت نہیں انسان ہے۔

ادھر آنٹی فردوس کے ساتھ موجود ثانی اور رابی چھت کی جانب بھاگیں، مگر اُن کے پہنچنے تک وہ جا چکا تھا۔ انہوں نے چھت کا جائزہ لیا اور اسی دوران دروازے کی بیل بجی۔ ماہی اور یشا آ چکی تھیں۔

ہم اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ سکے کیونکہ اندھیرا بہت تھا، مگر وہ کہاں سے آیا اور کدھر گیا یہ ہمیں پتا چل گیا ہے۔ یشا نے جلدی سے اندر آتے ہی کہا۔

تو ہم اب وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ معمہ کیا ہے۔ رابی جھٹ سے بولی۔

اس وقت؟ آنٹی نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

جی ہاں اسی وقت جانا ضروری ہے۔ ثانی نے بھی کہا تو آنٹی مان گئی۔ وہ چاروں آنٹی فردوس کے ساتھ پچھلے گھر میں پہنچ گئیں جہاں انور انکل اُن کی بیوی، دو بیٹے اور ایک بیٹی رہتے تھے۔ انکل اس وقت گھر نہ تھے۔ البتہ اُن کی بیوی اور بچے گھر پر تھے۔

سلام دعا کے بعد انکل انور کی بیوی نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور اب وہ سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔ آنٹی فردوس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ تب ہی انکل انور کی بیوی نے یوں اچانک آنے کا سبب پوچھ لیا۔ اس سے پہلے کہ آنٹی کوئی بات کرتی، رابی نے ان کے تینوں بچوں کو گھورنے کے بعد بھوت کا اعلان کر دیا۔

''اُن کی بیٹی نیلو بھوت ہے۔''

رابی کی اس بات پر سب اسے گھورنے لگے، تو رابی بولی:

''میرا مطلب ہے جو چھت پر آنٹی فردوس کو پریشان کر رہا ہے وہ کوئی بھوت نہیں نیلو ہے۔''

''مگر اس نے تو لڑکوں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔'' یشا اور ماہی فوراً بول اٹھیں کیونکہ انہوں نے دوربین سے اسے دیکھا جو تھا۔

ہاں شاید اسی لیے وہ لڑکوں والے کپڑے پہن کر گئی تھی کہ کسی کو اس پر شک نہ ہو۔ تب ہی رابی نے اپنی جیب سے ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی نکالی جو کہ سرخ رنگ کی تھی۔ بالکل ایسی ہی چوڑیاں اس وقت نیلو نے پہن رکھی تھیں۔ دیوار پھلانگ کے آتے جاتے ہوئے اس کی چوڑی ٹوٹ گئی تھی۔ جو رابی کو چھت پر جائزہ لیتے ہوئے ملی تھی۔ سب اب نیلو کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تب نیلو نے بتایا: ''کہ کچھ دن پہلے وہ گلی میں سے گیند اچھالتی گزر رہی تھی کہ اُس کی گیند آنٹی فردوس کے گھر میں گر گئی۔ جب اس نے بیل بجا کر گیند مانگی تو آنٹی نے صاف انکار کر دیا اور اوپر سے اسے بہت ڈانٹا۔'' وہ ہمیشہ ہی سب بچوں کو ڈانٹتی ہیں۔ اس لیے اس نے انہیں تنگ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ نیلو نے ساری بات بتا کر سر جھکا لیا۔ نیلو کی امی کو اس کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ وہ اسے ابھی ڈانٹتی کہ آنٹی فردوس بول پڑیں ''رہنے دیں بچی کی کوئی غلطی نہیں۔ میرے ہی سخت رویے نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا، مگر میں آئندہ کوشش کروں گی کہ لوگوں سے نرمی سے پیش آؤں۔'' آنٹی فردوس بھی شرمندہ اور اداس تھی۔

نیلو نے آنٹی فردوس سے معافی مانگی اور آنٹی نے بھی اپنے رویے کی سب سے معافی مانگی۔ اس کے بعد آنٹی اور لڑکیاں اُن کے گھر سے نکل آئیں۔ راستے میں آنٹی نے ٹیم کھوجی کو خوب شاباش دی اور انہیں کہا کہ وہ اُن کے گھر آتی جاتی رہا کریں۔ یہ سن کر لڑکیاں حیران ہوئیں۔ انہوں نے آنٹی کو خدا حافظ کہا اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔☆

نیا گھر

فرزین لہرا

چھٹیوں میں بور ہوتے بچوں سے دادی ماں مخاطب ہوئیں۔

''بچو! آپ سب ایک ہفتے کے لیے اپنی پھپھو کے گھر جا رہے ہیں۔'' چاروں بچے خوشی سے ناچنے لگے۔ دادی ماں ان کی خوشی دیکھ کر طمانیت سے مسکرانے لگی۔

احمد بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، پھر امیمہ، حمنہ اور رومیصہ تھی۔ چاروں بھائی بہن الگ الگ مزاج کے تھے، لڑتے بھی خوب تھے اور ایک دوسرے کے بغیر گزارا بھی نہ تھا پورا خاندان کراچی کے ایک علاقے میں مقیم تھا۔ چاروں بچوں کو اپنی پھپھو کے گھر جانا بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ پھپھو کا گھر شہر سے باہر پرسکون اور صاف آب و ہوا میں بنا ہوا تھا اور جدید سہولتوں سے آراستہ تھا۔ وہاں کی اونچی عمارتیں، خوبصورت گھر اور ان کے پسندیدہ ریسٹورنٹس کا ایک ساتھ ہونا بچوں کے لیے بڑی کشش رکھتا تھا۔ پھپھو صبا بھی ان سب سے بے حد پیار کرتی تھی اور ان کی شرارتوں میں خوب ساتھ بھی دیتی۔ اب جب وہاں ایک ہفتے کے لیے رہنے کا سنا تو بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ سب جلدی جلدی اپنے پسندیدہ کھلونے، کتابیں، اور کپڑے پیک کرنے لگے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جب انہیں نکلنا تھا، خوشی ان کے چہرے پر چمک رہی تھی اور آنکھیں ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھی، دادی ماں نے ان سب کو پیار کیا اور ڈرائیور انکل کو تاکید کی کہ انہیں حفاظت سے پھپھو کے گھر چھوڑ آئیں۔ دادی ماں نے پھپھو کے لیے ان کی پسند کے شامی کباب بھی بنا کر ساتھ دے دیئے تھے۔ چاروں بچے گاڑی میں سوار ہو گئے اور پھپھو کے گھر کی باتیں کرتے کرتے کب وہاں پہنچ گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ حیرت کا جھٹکا انہیں تب لگا جب انہوں نے پھپھو کے گھر کی جگہ کسی اور گھر پر گاڑی کو رکتے دیکھا، ہارن کی آواز پر اس گھر کا دروازہ کھلا اور دوسرا حیرت کا جھٹکا تب لگا جب دروازے سے پھپھو باہر آئیں، چاروں بچے گاڑی سے اترے اور پھپھو کے گلے لگ گئے، احمد نے پوچھا:

''صبا پھپھو! یہ تو آپ کا گھر نہیں، پھر آپ یہاں کیسے؟''

باقی تینوں بچے بھی سوالیہ نظروں سے صبا پھپھو کو دیکھنے لگے، صبا پھپھو ہنستے ہوئے انہیں ساتھ لے کر اندر آ گئی، بچے گھر کے اندر داخل ہو گئے اور چاروں طرف گھوم گھوم کر گھر دیکھنے لگے، گھر بلاشبہ بہت شاندار تھا، صبا پھپھو نے سب کو جوس دیا اور آرام سے صوفے پر بیٹھ کر بتانے لگیں:

''پیارے بچو! آپ کے پھوپھا جی کل رات کی فلائیٹ سے اسلام آباد چلے گئے ہیں، نیا گھر اور میں اکیلی اس گھر میں کافی اجنبیت محسوس کر رہی تھی، اس لیے آپ سب کو بلا لیا ہے، اب ہم ایک ہفتہ خوب مزے کریں گے، کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟'' بچوں کی حیرانی دور ہوئی اور وہ جوس کے خالی گلاس کچن میں رکھنے چلے گئے۔ صبا پھپھو انہیں گیسٹ روم میں لے گئیں، جہاں چار سنگل بیڈ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے تھے، ایک الماری، ایک ڈریسنگ ٹیبل اور ایک چار سیٹوں پر مشتمل آرام دہ صوفہ بھی رکھا تھا، بچوں کو یہ کمرہ بہت پسند آیا، وہ اپنا سامان کھول کر کمرے میں سیٹ کرنے لگ گئے۔ امیمہ نے

ڈریسنگ ٹیبل پر اپنا بال بنانے کا برش، اور پاؤڈر رکھ دیا، حمنہ ابھی اپنا پینٹنگ کا سامان نکال ہی رہی تھی کہ احمد نے الماری کھول کر اسے بلایا:

''حمنہ! یہ دیکھو یہ شیلف تمہارا ہے، ٹھیک ہے نا؟'' حمنہ اپنا سامان چھوڑ کر احمد کے پاس گئی اور الماری میں شیلف دیکھ کر اثبات میں سر ہلا کر دوبارہ سامان کی طرف آ گئی، لیکن اب وہاں پینٹنگ کا سامان غائب تھا۔ حمنہ نے رومیصہ کی طرف دیکھا تو وہ اپنے بیڈ پر بلاکس لے کر بیٹھی تھی۔ امیمہ بھی اپنی کتابیں سیٹ کر رہی تھی۔

''کس نے میرا سامان چھپایا ہے؟ جلدی سے بتا دو ورنہ میں پھپھو سے شکایت لگاؤں گی'' حمنہ نے دھمکانے والا انداز اپنایا۔

''میں نے نہیں چھپایا نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہے کہ تمہاری چیزیں چھپاتی پھروں'' امیمہ نے کہا، رومیصہ نے اپنے بلاکس سے سر اٹھائے بنا مصروف انداز میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''آپی! مجھے لگتا ہے کہ آپ لائی ہی نہیں تھیں پینٹنگ کا سامان، کہیں گھر پر تو نہیں رہ گیا؟'' احمد الماری میں اپنے کپڑے سیٹ کرتے ہوئے کہنے لگا:

''حمنہ! آپ کی تو یہ ہمیشہ کی عادت ہے چیزیں بھول جانے کی، کب بڑی ہوں گی آپ؟'' حمنہ ان سب کے جوابات پر جز بز ہو کر وہیں منہ بسور کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ کیا وہ واقعی گھر ہی بھول آئی ہے؟ کہیں یہ سب اس کے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے؟ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ امیمہ اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی:

''حمنہ! جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ میں نے آپ کا پینٹنگ کا سامان نہیں چھپایا ہے تو آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا؟ واپس کرو میرا ہیئر برش؟'' امیمہ کا غصے بھرا لہجہ اور غلط الزام سن کر حمنہ کا تو خون ہی کھول گیا۔

''آپی! کسی پر جھوٹا الزام لگانے سے پہلے سوچ لیا کریں۔ میں تو کب سے یہیں بیٹھی ہوں اور ڈریسنگ ٹیبل تک تو گئی بھی نہیں'' حمنہ کا صاف جواب سن کر امیمہ کا دماغ گھوم گیا اور دونوں بہنیں آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں۔ احمد نے لاپرواہی سے ان دونوں کو دیکھا اور بیڈ پر نیم دراز ہو کر الف نگر پڑھنے لگا، جبکہ رومیصہ بھاگتی ہوئی پھپھو کو بلانے چلی گئی، صبا پھپھو کمرے میں داخل ہوئیں اور دونوں بہنوں کو الگ کرتے ہوئے حیرانی سے بولیں:

''کیا ہو گیا ہے امیمہ اور حمنہ؟ یہ کس طرح آپ دونوں لڑ رہی ہو؟ اچھی بات ہے یہ؟ میں بریانی بنا رہی تھی آپ سب کے لیے اور ایسے ہی بھاگتی ہوئی آئی ہوں، ارے احمد بیٹا! ذرا بھاگ کر چولہا تو بند کر کے آؤ ایسے ہی جلتا چھوڑ کر بھاگی ہوں۔'' احمد سعادت مندی سے اسی وقت کمرے سے نکل گیا جبکہ صبا پھپھو دونوں کا جھگڑا سننے لگیں، ساری بات جان کر صبا پھپھو بولیں۔''

''رکو! آپ دونوں، ابھی دیکھتی ہوں میں کہ آپ دونوں کا سامان کہاں گیا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم پھر کر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگیں، آخر میں انہوں نے الماری کھولی اور ایک سکون کی سانس لی۔

''ہاں بھئی! یہ رہا پینٹنگ کا سامان اور ہیئر برش، آپ دونوں نے الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گئی'' رومیصہ نے اپنی دونوں بہنوں کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

''صبا پھپھو، الماری تو کب سے احمد بھیا کھولے کھڑے تھے، یہ دونوں تو الماری کی طرف گئی ہی نہیں۔'' پھپھو رومیصہ کی بات سن کر سمجھ گئیں کہ یہ سب احمد میاں کی کارستانی ہے۔

''پھپھو! چولہا بند کر دیا ہے، کچن تو بڑا پیارا ہے آپ کا، خاص طور پر کچن کی کھڑکی سے نظر آتا ہرا بھرا لان۔'' احمد اپنی دھن میں یہ سب کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور سب کو اپنی جانب گھورتا پا کر چپ ہو گیا۔ ''کیا ہو گیا بھئی! سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں جیسے میرے سینگ نکل آئے ہوں؟'' صبا پھپھو نے آگے بڑھ کر احمد کا کان مڑوڑا۔

''احمد آپ اتنے شرارتی ہو گئے ہو مجھے نہیں پتا تھا، دونوں بہنوں کی چیزیں چھپا کر ان دونوں کو آپس میں لڑوا دیا اور خود مزے سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔'' احمد صبا پھپھو کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

''صبا پھپھو! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا اور میں تو ان دونوں سے بڑا بھی ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے ان دونوں کو تنگ کرنے کی؟ ضرور یہ دونوں مجھے پھنسا رہی ہیں'' صبا پھپھو دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

''سوری پھپھو! ہماری وجہ سے آپ پریشان ہوئیں، اب ہم آپ کو بالکل بھی تنگ نہیں کریں گے۔'' صبا پھپھو نے اپنا سر اٹھایا اور پیار سے ان چاروں کو دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک ناک سکیڑ کر ہڑبڑا کر بھاگیں۔

''اُف! یہ جلنے کی بو کہاں سے آ رہی ہے؟'' چاروں بچے بھی ان کے ساتھ کچن میں بھاگے، کیا دیکھتے ہیں کہ بریانی کے پتیلے کے نیچے چولہا پوری آنچ پر جل رہا ہے اور پتیلے سے دھواں اٹھتا ہوا پورے کچن میں بھر رہا تھا، پھپھو نے جھٹ چولہا بند کیا اور کچن کی کھڑکی کھول دی، سارا دھواں اب کھڑکی کے راستے باہر جا رہا تھا، صبا پھپھو نے احمد کی طرف دیکھا۔

''آپ کو چولہا بند کرنے بھیجا تھا اور آپ چولہا بند کیے بغیر کچن اور لان کا نظارہ کر کے واپس آ گئے؟'' احمد جو خود یہ منظر دیکھ کر حیران تھا پھپھو کی بات سن کر اور بھی پریشان ہو گیا۔ ''لیکن پھپھو! میں نے تو'' پھپھو نے احمد کی بات ہی پوری نہیں ہونے دی، ''بس اب اور کہانیاں سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آپ کی سزا یہ ہے کہ ہم سب برگر کھانے باہر جائیں گے اور آپ گھر پر اکیلے رہیں گے۔

یہ بات سن کر کھانستے ہوئے بچے خوشی سے اچھل پڑے جبکہ احمد سوچ میں پڑ گیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے، ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے، صبا پھپھو نے بچوں سے کہا:

''آپ سب تیار ہو جائیں۔ ہم سب باہر کھانا کھانے جا رہے ہیں'' تھوڑی ہی دیر

میں صبا پھپھو تینوں بہنوں کو لے کر چلی گئی اور احمد لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا سوچنے لگا کہ آخر یہ سب اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک ہی چوں چاں جیسی آواز احمد کے کانوں سے ٹکرائی، وہ آواز کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگا، بڑھتے بڑھتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں اسٹور روم بنا ہوا تھا، احمد اسٹور روم میں داخل ہو گیا اور چاروں طرف نظریں گھماتا ہوا اس آواز کو کھوجنے لگا، آواز اب پہلے کی نسبت بہت تیز تھی اور اسے یقین تھا کہ یہیں کہیں قریب سے ہی آ رہی ہے، اسٹور روم تاریک تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک پینٹنگ پر پڑی، اس پینٹنگ کے رنگ اُڑے ہوئے تھے اور وہ دیوار پر ایسے ترچھی آویزاں تھی جیسے کسی کو کہہ رہی ہو کہ براہ کرم مجھے سیدھا کر دیں۔ احمد بے ساختہ اس پینٹنگ کی طرف بڑھا۔ لاشعوری طور پر اس نے پینٹنگ سیدھی کرنی چاہی تو فریم ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا، احمد کے دونوں ہاتھ مٹی سے اَٹ گئے تھے۔ فریم دیوار سے جدا ہوتے ہی احمد کو دیوار میں ایک دروازہ سا نظر آیا جو کہ ادھ کھلا تھا، چوں چاں جیسی آواز اب اور بھی زیادہ آ رہی تھی۔ احمد نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا دروازہ بنا کسی رکاوٹ کے کھلتا چلا گیا۔ نیچے جاتی سیڑھیاں اس بات کا ثبوت تھیں کہ یہ تہہ خانے کا راستہ ہے۔ احمد دھڑکتے دل کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا، ایک ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی، وہ احتیاط سے سیڑھیاں اترتا ایک سرنگ نما برآمدے میں پہنچا جس کے آخری کونے سے یہ آواز آ رہی تھی، احمد کا دل چاہا کہ وہ یہیں سے پلٹ جائے لیکن اس کے قدم میکانکی انداز میں آگے بڑھتے گئے، کاریڈور کے اختتام پر موجود ایک بڑا روشن کمرہ تھا جہاں پر ایک جھولنے والی کرسی پر کوئی بیٹھا جھول رہا تھا، احمد ڈر گیا۔ وہ ایک بار پھر واپس پلٹنا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے، کرسی کے جھولنے سے ہی چوں چاں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ یکا یک کرسی جھولنا بند ہو گئی اور کوئی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، احمد نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں، قدموں کی چاپ بتا رہی تھی کہ کوئی اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خوف سے احمد کی گھگھی بندھ گئی، اپنے کندھوں پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوتے ہی احمد نے اپنی آنکھیں کھولیں، ایک بلند قامت وجود اس کے سامنے کھڑا تھا، اتنا لمبا کہ اس کا قد چھت کو چھو رہا تھا، وہ اپنی موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے احمد کو دیکھ کر مسکرایا، اس کے بڑے بڑے سفید دانت بے حد نمایاں تھے۔

''تم کون ہو؟'' آواز میں بادلوں جیسی گرج تھی۔ جسے سن کر احمد کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

''مم مجھے جانے دو، پلیز مجھے جانے دو'' احمد شدید خوفزدہ تھا، جن نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور احمد کو اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے پکڑ کر اپنے چہرے کے مقابل لے آیا۔

''ڈرو نہیں، بچے مجھے بہت پسند ہیں، تم مجھے جن دادا بلا سکتے ہو'' احمد کے اوسان کچھ بحال ہوئے، پھر اس کے ذہن میں ایک خیال سا کوندا۔

''کیا آج جو کچھ بھی ہوا اس کے پیچھے آپ کا ہاتھ تھا؟'' جن دادا نے شرارتی مسکراہٹ سے جواب دیا:

''بالکل ٹھیک سمجھے ہو، میں تم بچوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہو گیا تھا کہ میرا شرارت کرنے کو دل چاہا۔'' اب احمد کا اعتماد واپس لوٹنے لگا۔

''آپ کی وجہ سے مجھے اتنی ڈانٹ پڑی اس کا کیا؟''

''اسی لیے تو تمہیں یہاں بلوایا ہے۔''

''آنے دیں پھپھو کو، میں بتاؤں گا انہیں یہ سب۔ آپ کا کیا دھرا ہے'' جن دادا نے ایک اور جناتی قہقہہ لگایا۔

''اگر کوئی تمہاری بات پر یقین کرے تو شوق سے بتانا'' اتنے میں باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی، احمد نے جن دادا سے کہا:

''لگتا ہے پھپھو اور سب آ گئے ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں میں انہیں بتاؤں گا سب'' جن دادا نے مسکراتے ہوئے کہا:

''چلو میں تمہیں لے چلتا ہوں۔''

انہوں نے چٹکی بجائی اور پلک جھپکتے میں وہ ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ صبا پھپھو تینوں بہنوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں، احمد نے انہیں سلام کیا، صبا پھپھو نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا:

''احمد! کیا آپ اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہیں؟'' احمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر کہا:

''پھپھو! یہ دیکھیں، یہ سب ان جن دادا کی کارستانی ہے اور آپ نے مجھے ڈانٹ دیا، صبا پھپھو نے حیرت سے دیکھا۔''

''کون جن دادا؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' احمد نے جن دادا کی طرف اشارہ کیا جو وہیں کھڑے دلچسپی سے سب دیکھ رہے تھے۔

''یہ رہے نا، آپ سب کے سامنے ہی تو ہیں۔'' امیمہ اور حمنہ بھی بے یقینی سے اپنے احمد بھیا کو دیکھنے لگیں۔ صبا پھپھو نے ڈرتی ہوئی رومیصہ کا ہاتھ پکڑ لیا احمد انہیں کھینچتا ہوا اسٹور روم تک لے گیا، تینوں بہنیں بھی ساتھ ساتھ ہو لیں۔

''آئیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں جن دادا کا تہہ خانہ'' لیکن اسٹور روم کی جگہ تو دیوار پر ایک لکڑی کی الماری تھی، اب تو احمد کے طوطے اڑ گئے، صبا پھپھو غصے سے بولی:

''احمد! بس کرو جھوٹ بولنا'' جن دادا ایک بار پھر ہنسنے لگے۔ اب احمد کو سمجھ آ گیا کہ وہ اپنی بات کبھی ثابت نہیں کر پائے گا۔ اس نے بے بسی سے جن دادا کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

''بس اب بہت شرارت ہو گئی، میں اپنی دنیا میں واپس جا رہا ہوں، تم سب آرام سے رہو۔'' یہ کہہ کر وہ تو غائب ہو گئے لیکن پھپھو احمد سے بہت دن خفا رہی۔ ☆

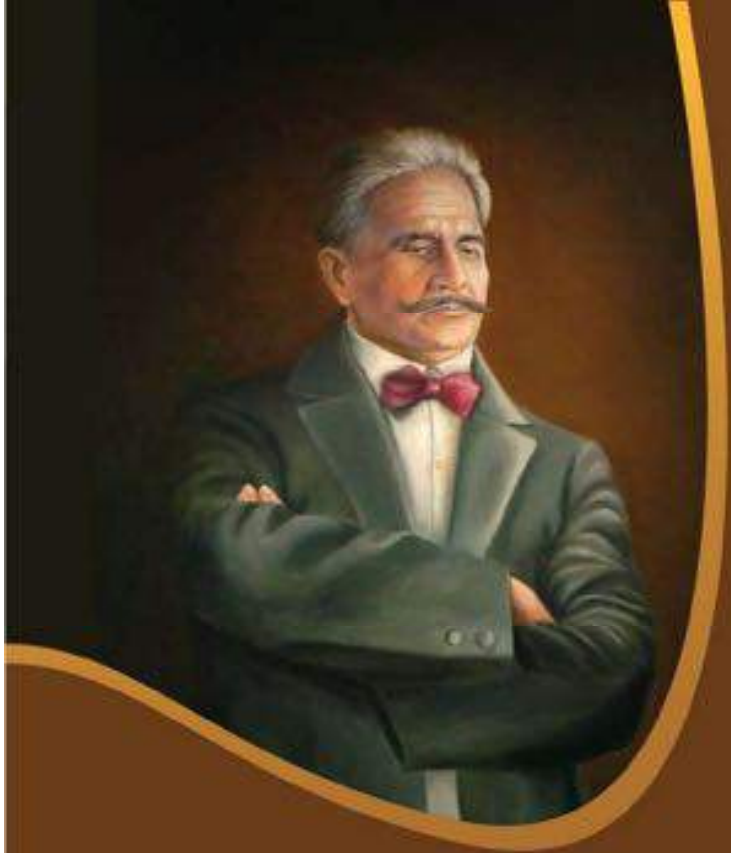

میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں۔۔۔

سیدہ نیّر عامر

پیارے بچو! آج ہم آپ کو ایک ایسے بچے کی کہانی سناتے ہیں، جو بہت ہی چھوٹا سا تھا، لیکن اس کی سوچ کی اُڑان بہت اونچی تھی۔

جیسے کچھ پرندے فضا میں بے انتہا بلندی پر پہنچ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح وہ بھی سوچتے سوچتے بہت دور نکل جاتا تھا۔

اسے پرندے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اکثر آسمان کی بلندیوں پر اُڑتے پرندوں کو دیر تک دیکھتا رہتا، اندھیری راتوں میں چمکتے جگنوؤں کا مشاہدہ کرتا۔ اسے خدا کی یہ مخلوقات ہمیشہ اپنی جانب متوجہ رکھتی۔

جب وہ جگنو کی روشنی کو دیکھتا تو اکثر اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ یہ معمولی سی روشنی بھی کتنی پیاری ہے! جگنو اس کے ذریعے کسی بھولے بھٹکے کو راستہ دکھا سکتے ہیں۔ کسی اکیلے، اُداس بیٹھے پرندے کی مدد کر سکتے ہیں۔ یہ ننھی سی روشنی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قوتِ مشاہدہ مزید پروان چڑھتی گئی۔ جگنوؤں، پروانوں سے بڑھ کر اس کی توجہ پہاڑوں، چٹانوں اور شاہین کی پرواز تک جا پہنچی۔ ان تمام بلندیوں کو دیکھ کر اُس نے غور و فکر کے بعد مختلف نتیجے نکالے اور بہت کچھ سیکھا۔ جوں جوں یہ لڑکا بڑا ہوتا جاتا، اس کے خیالات میں بھی نیا جوش و ولولہ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

اسے علم سے بے حد محبت تھی۔ یہ محبت اس نے پروانے سے سیکھی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا، پروانے کی طرح دیوانہ وار لپک کر ہر اس جگہ پہنچ جائے جہاں سے علم کا حصول ممکن ہو۔ وہ نہ صرف خود علم حاصل کرنا چاہتا تھا بلکہ اپنے ملک و قوم کو بھی علم کے نور سے روشن کر دینا چاہتا تھا۔ اپنی قوم ہی نہیں، پوری دنیا کے انسانوں کا درد، وہ اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی بھی صورت دوسروں کی تمام تر تکلیفیں دور کر دے۔ اس کے نزدیک صرف ''وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو دوسروں کے کام آنا جانتے ہوں۔'' خاص طور پر غریب اور ضعیف افراد سے اسے خصوصی لگاؤ تھا۔

یہ سب باتیں وہ بچپن سے ہی سوچا کرتا تھا۔ مگر عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے، اپنے خیالات کو نظموں کی صورت میں ڈھال کر، لکھنا شروع کر دیا۔ اُس کی نظمیں بچوں اور بڑوں، دونوں میں یکساں مقبول ہونے لگیں۔ ان نظموں کے ذریعے اُس نے بچوں، جوانوں اور بُزرگوں، سب کے خیالات میں نئی روح پھونک دی۔ ہر ایک سوچنے لگا، اس طرح تو میں بھی دوسروں کے کام آ کر اچھا اور بڑا انسان بن سکتا ہوں۔

ان ہی نظموں میں سے ایک نظم،

''میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں،
پر کام کروں گا بڑے بڑے''

خود اُس کی اپنی ذات پر صادق آتی ہے۔ واقعی اس چھوٹے سے لڑکے نے بڑے ہو کر بہت بڑے بڑے کام کیے۔ یہ اسی کی شاعری تھی جس نے برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے دِلوں میں آزادی کی شمع روشن کی۔ ان پر اُس کی شاعری کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ سب کے سب آپس میں متحد ہو گئے۔ اُس نے ان کی آنکھوں کو خواب دیکھنا سکھا دیا۔ ایک خوبصورت مستقبل کا خواب!

ایک ایسا خواب، جس میں اُنہیں علیحدہ وطن کی واضح تصویر نظر آنے لگی۔ جہاں وہ اسلام کے سکھائے ہوئے اُصولوں کے مطابق آزادانہ زندگی گزار سکیں۔

یہ اسی بیداری کا نتیجہ تھا کہ برِصغیر کے مسلمان اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئے اور بالآخر ایک آزاد مسلم ریاست، ''پاکستان'' کا قیام عمل میں آیا۔

پیارے بچو! کیا آپ، اُس چھوٹے سے لڑکے کا نام بتا سکتے ہیں۔۔۔۔۔؟

جی ہاں! یہ کہانی ہمارے شاعرِ مشرق،

''ڈاکٹر علامہ محمد اقبال'' کی ہے۔ جو نو نومبر اٹھارہ سو اٹھہتر (۰۹-۱۱-۱۸۷۸) کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

آپ نے دیکھا! کس طرح اُنھوں نے اپنی سوچ کی بُلندی کے ذریعے ایک پوری قوم کی تقدیر بدل ڈالی۔۔۔! ☆

گڑیا

حسن عمر

دس سالہ مریم اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے شہر میں رہتی تھی۔ وہ نہایت ہی ہنس مکھ اور پیاری سی بچی تھی اور اپنے ماں باپ کی بے حد لاڈلی بھی تھی۔ اس کے ماں باپ اس پر جان چھڑکتے تھے اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ سکول میں مریم کی ایک سہیلی تھی، بینا جس کے ساتھ وہ سکول سے آنے کے بعد بھی ہر وقت کھیلتی رہتی تھی اور اکثر شام کو وہ اپنا ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد اس کے گھر چلی جایا کرتی۔ ایک روز سکول سے واپس آنے کے بعد وہ ہوم ورک مکمل کر کے وہ اپنی امّی کے پاس آئی اور ان سے کہنے لگی:

''امّی! میں بینا کے گھر جا رہی ہوں۔ مغرب تک آجاؤں گی۔''

اُس کی امّی اس وقت باورچی خانے میں مصروف تھیں، انہوں نے اندر سے ہی آواز لگائی:

''ٹھیک ہے، لیکن مغرب سے پہلے آ جانا۔ مغرب کے وقت باہر رہنا ٹھیک نہیں۔''

''امّی اب میں بڑی ہوگئی ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوتا۔'' مریم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

امی مریم کی بات سن کر مسکرا دیں۔ مریم اس ہی طرح ٹہلتے اور اچھلتے کودتے بینا کے گھر پہنچ گئی۔ بینا کے گھر جا کر اس نے دیکھا کہ بینا کے پاس ایک بہت خوب صورت گڑیا ہے جو اس کے ماموں اس کے لئے باہر سے لے کر آئے تھے۔ اس گڑیا کی آنکھیں کرنجی اور بال بھورے تھے۔ مریم کو وہ گڑیا بے حد پسند آئی اور اس نے دل میں سوچا کہ کاش میرے پاس بھی ایسی کوئی گڑیا ہوتی۔ بینا کے گھر سے واپس آ کر وہ کچھ اداس لگ رہی تھی۔ اس کے ابّو نے اُس کو پریشان دیکھا تو اُس سے پوچھنے لگے:

''کیا ہوا؟ میری گڑیا اتنی اداس کیوں ہے؟''

''بینا کے پاس ایک بہت پیاری سی گڑیا ہے۔'' مریم نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''تو؟ آپ کے پاس بھی تو اتنی ساری گڑیا ہیں میری جان؟'' اس کے ابّو نے اُس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ گڑیا بہت پیاری ہے۔ اس کے بال اتنے پیارے ہیں، اور اُس نے جو فراک پہنی ہوئی ہے، وہ بھی اتنی پیاری ہے۔ کاش! میرے پاس بھی ویسی ہی گڑیا ہوتی۔'' مریم اُس گڑیا کے بارے میں بتاتے ہوئے جذباتی سی ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس کے امّی ابّو نے یہ دیکھا تو مسکرانے لگے۔ اُس کے ابّو نے اُس سے کہا:

''اچھا ٹھیک ہے، میں کل اپنی گڑیا کے لئے دفتر سے واپسی پر بالکل ویسی ہی پیاری سی گڑیا لے کر آؤں گا۔''

مریم بے حد خوش ہوگئی۔

دوسرے دن مریم سکول سے واپس آئی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے گھر کے صحن میں ایک بہت پرانا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا ہے۔ وہ حیرانی سے صندوق کو دیکھنے لگی۔

''امّی! کہاں ہیں آپ؟''

اُس کی امّی باورچی خانے سے اپنے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر صحن میں آگئیں۔ مریم نے الجھن بھرے انداز میں اُن سے پوچھا:

''امّی! یہ صندوق کس کا ہے؟''

اُس کی امّی نے مسکراتے ہوئے کہا:

''یہ تمہارے لئے سرپرائز ہے۔''

مریم ان کی بات سن کر خوش ہوگئی، پھر اس کی امّی نے بتایا:

''ہمارے علاقے میں پرانے سامان کی ایک دکان کھلی ہے۔ وہاں جو بوڑھی عورت کام کرتی ہے، آج میری اس سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے یہ تحفہ دیا ہے ہمیں۔ کہہ رہی تھی کہ بہت کام کی چیز ہے یہ۔''

مریم نے خوشی خوشی اپنی ماں کو پیار کیا اور صندوق کو بمشکل اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ صندوق کافی وزنی تھا۔ اسے کمرے میں لاکر مریم نے اشتیاق سے اسے چابی کی مدد سے کھولا اور اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس صندوق کے اندر ایک سفید گدا بچھا ہوا تھا جس پر چار قد آدم گڑیا موجود تھیں، اور وہ کوئی عام گڑیا نہیں تھی۔ چاروں گڑیا چینی کی گڑیا تھیں اور ان چاروں نے خوب صورت رنگوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ مریم نے پہلی گڑیا کو اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا، اس نے سرخ رنگ کی فراک پہن رکھی تھی، اور اس کے بھورے بال ایک چٹیا کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ مریم نے جیسے ہی اُس گڑیا کو ہاتھ میں لیا، اس کو یوں لگا جیسے ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی ہو۔ اُس نے اُس گڑیا کی آنکھوں میں دیکھا، تو اُسے یوں لگا کہ جیسے وہ گڑیا اُس کو گھور رہی ہے۔ پھر اس نے دوسری گڑیا کو اُٹھایا، جس نے سبز رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے لمبے بھورے بال کمر تک کھلے ہوئے تھے، اسے اٹھاتے ہی مریم کو پھر ایک سرد سی لہر اپنے جسم میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد اُس نے تیسری گڑیا کو اٹھایا جس کے گھنگریالے بال اُس کے کندھے تک تھے۔ مریم کو پھر ویسا ہی محسوس ہوا۔ آخری گڑیا کو اٹھاتے ہوئے مریم کو کچھ مزید ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اس گڑیا کے بال سرخ رنگ کے تھے اور دو چٹیوں میں بندھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں نیلے رنگ کی تھیں۔ مریم نے اُن چاروں کو ایک بار پھر صندوق میں رکھ دیا اور اپنی ماں کے پاس جا کر کہنے لگی:

''امّی میں ہوم ورک کر کے بینا کے پاس جا رہی ہوں، اس کو اپنے ساتھ گھر لے کر آتی ہوں۔ وہ میری اتنی پیاری پیاری گڑیاؤں کو دیکھے گی تو وہ بھی خوش ہوگی۔''

اُس کی امّی نے مسکراتے ہوئے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ مریم بینا کے گھر پہنچی اور دونوں روز کی طرح کھیلنے کودنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بینا کی امّی بے حد پریشانی میں اُن لوگوں کے پاس آئیں اور فون مریم کو پکڑاتے ہوئے کہنے لگیں:

''مریم بیٹا! تمہاری امّی کا فون ہے۔''

پریشانی کے عالم میں مریم نے فون ان کے ہاتھ سے لے لیا:

''ہیلو!''

مریم کی آواز سن کر اُس کی امّی چیخنے لگیں:

''مریم! واپس مت آنا۔ وہیں رہو۔ بینا کے گھر پر رہو۔''

مریم ماں کی بات سن کر مزید پریشان ہوگئی:

''امّی کیا ہوا؟ آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں؟''

مریم کی امی نے بمشکل جواب دیا:

''وہ۔۔ وہ گڑیا! وہ سب زندہ ہیں۔ وہ میرے قریب آ رہی ہیں۔ بچاؤ!''

فون پر امّی کی چیخیں گونجنے لگیں اور پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔ روتے ہوئے مریم نے وہاں سے جانے کی ٹھان لی۔ بینا کی امّی اُس کو روکنے لگیں:

''بیٹا! تم اکیلی مت جاؤ۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تھوڑی دیر رک جاؤ، بینا کے ڈیڈی آنے والے ہیں۔ ہم سب ساتھ چلتے ہیں، کچھ نہیں ہوا ہوگا تمہاری امّی کو۔''

''نہیں! مجھے امّی کے پاس جانا ہے۔'' زاروقطار روتے ہوئے وہ وہاں سے نکل کر اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ گھر پہنچتے ہی ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ وہ اپنی امّی کو آوازیں دینے لگی:

''امّی! امّی! کدھر ہیں آپ؟''

کوئی جواب نہ ملا۔ اچانک اُس کو اُوپر والی منزل سے زوردار آوازیں آنے لگیں:

''ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک۔''

''امّی کہاں ہیں آپ؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

اُس کے کانوں میں ایک سرسراتی ہوئی آواز آئی:

''میں یہاں ہوں۔ اوپر آجاؤ میرے پاس۔ مل لو اپنی امّی سے۔''

مریم آواز سن کر سناٹے میں آگئی اور ہمت کر کے اوپر والی منزل پر موجود کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ شور مزید بڑھنے لگا۔ کمرے کے قریب آتے ہی اُسے زمین پر کافی زیادہ خون نظر آیا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی اور اپنی امّی کو ایک بار پھر آوازیں دینے لگتی ہے:

''امّی! امّی! کدھر ہیں آپ؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

اچانک اُس کی نظر اپنے بالکل سامنے موجود چاروں گڑیاؤں پر پڑی جو ساکت کھڑی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ اُن کا بھیانک چہرہ دیکھ کر مریم سہم گئی اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہاں پر ایک اور گڑیا بھی تھی جس نے بالکل اُسی طرح کے کپڑے پہنے ہوئے تھے جیسے اُس کی امّی نے دوپہر میں پہن رکھے تھے۔

''امّی! امّی!''

مریم کے کان میں اچانک اُس کی امّی اور ابّو کی آواز آنے لگی:

''مریم! مریم بیٹا کیا ہوا؟''

مریم نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ منظر غائب ہو چکا تھا۔ اس کے سامنے اُس کے امّی، ابّو موجود تھے۔ مریم پوری طرح پسینے میں شرابور تھی۔ اس کے امّی ابّو اس کو فکرمندی سے دیکھتے رہے۔

بقیہ صفحہ نمبر: 07

اُلٹے میاں کے کارنامے

اُلٹے میاں بنے جاسوس

1 اُلٹے میاں جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔

2 ناول کا ہیرو اُلٹے میاں کو پسند آ گیا۔

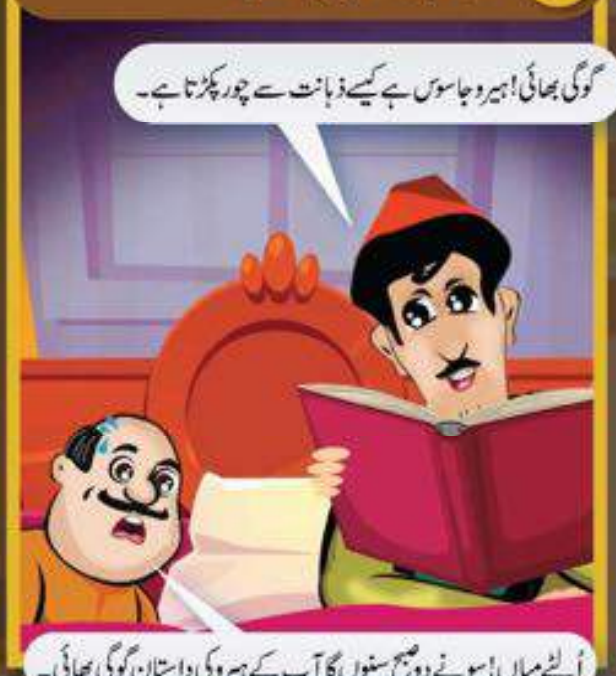

3 اُلٹے میاں ہوئے پُرجوش

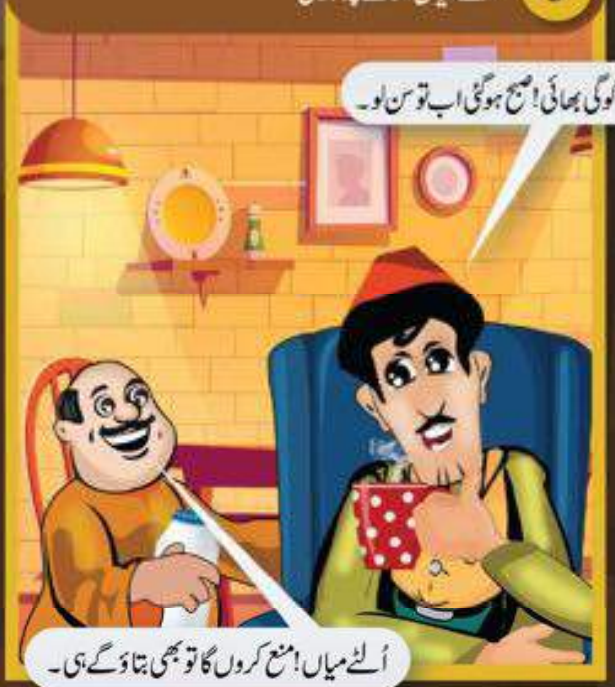

4 اُلٹے میاں نے ناول کے ہیرو کے بارے میں بتایا۔

5 اُلٹے میاں نے جاسوس بننے کی ٹھانی

6 اُلٹے میاں! نے کی جاسوسی

7 اُلٹے میاں بنے بہادر

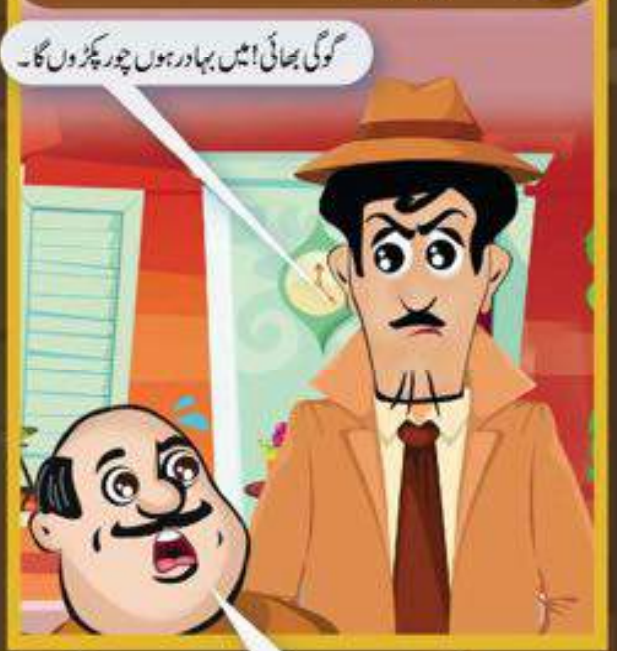

8 اُلٹے میاں کی ہوئی پٹائی۔

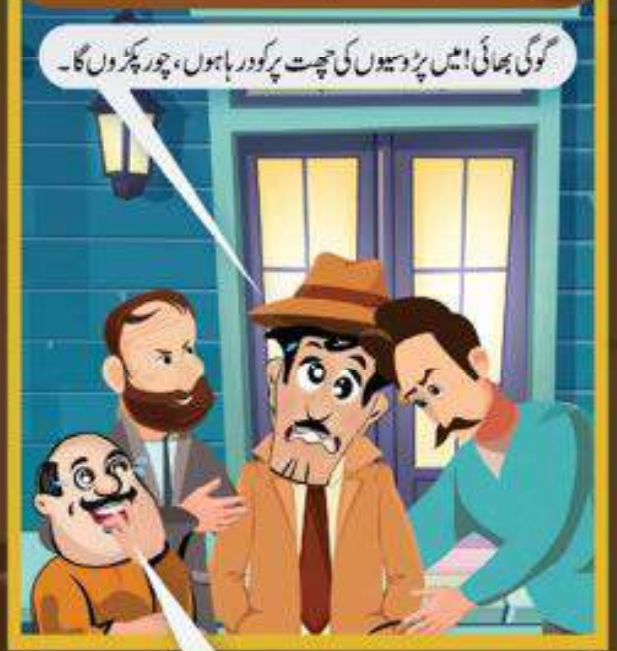

پودے

بنت مسعود احمد

رب کی نعمت پودے
ابو جی کے ساتھ ہم بھی
گھر کی رونق بڑھائیں گے
ہم پودے لینے جائیں گے
اور پودے لے کر آئیں گے
ڈھیروں پودے لاکر ہم تو
اپنا بھی گھر مہکائیں گے
تھوڑی ہوگی محنت اس میں
پر ہے دیکھو راحت اس میں
گرمی میں ہیں فرحت پودے
رب کی ہیں یہ نعمت پودے
گرمی بھاگے ٹھنڈک آئے
ایسی رب کی قدرت پودے
ہم پر ہیں یہ سایہ کرتے
ہم کو ہیں یہ لکڑی دیتے
پھل، سبزی، گندم کی روٹی
ان پودوں سے حاصل ہوتی
پیارے پیارے بچو آؤ
مل جل کر یہ محنت کرلو
گھر میں رب کی نعمت بھرلو
پودے لاکر، گھر مہکا کر
اپنے گھر میں سبزہ کرلو

گھوڑوں کا سردار

احمد عدنان طارق

چوہدری الیاس کے باڑے میں سولہ گھوڑے تھے۔ جن میں سے کچھ کا رنگ بھورا تھا اور کئی بالکل سیاہ تھے۔ صرف ایک گھوڑے کا رنگ سفید تھا۔ اُس کا نام بادل تھا۔ وہ کیونکہ اکلوتا سفید گھوڑا تھا اس لیے ہمیشہ اترا تا رہتا تھا۔ وہ کہتا:

''تم سارے عام سے گھوڑے ہو اور کیونکہ صرف میرا رنگ ہی گورا ہے اس لیے تم سب کو مجھے اپنا سردار مان لینا چاہیے۔'' دوسرے گھوڑے ہمیشہ اُس کی یہ بات سنتے۔ اُسے بے وقوف گردانتے اور اُسے نظر انداز کر کے منہ اُس کی طرف سے پھیر لیتے۔ ایک دن بادل دُلکی چال چلتا ہوا تالاب کے پاس گیا اور ساکن پانی، میں غور سے اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ وہ خود سے باتیں کرنے لگا وہ بولا۔ ''میری ایال بہت لمبی ہے اور اُس کے بال بھی بہت بے ترتیب ہیں۔ میرا خیال ہے مجھے اپنی ایال کے بالوں کو کٹوا لینا چاہیے۔ اس سے میں بہت خوبصورت دکھائی دوں گا اور باقی گھوڑے مجھے اپنا سردار تسلیم کر لیں گے۔ لہٰذا وہ نزدیکی پہاڑی پر جا کر کھڑا ہو گیا اور اُس پری زاد کا انتظار کرنے لگا جو خود بھی پورے چاند کی روشنی میں اپنے دیدہ زیب گھوڑے پر سوار ہو کر آتا تھا۔ پری زاد کا گھوڑا اتنا سفید تھا جیسے برف۔ اُس کی دودھیا ایال ہیروں سے جڑی ہوئی تھی اور اُس کی دم انتہائی شائستگی سے تراشی گئی تھی اور وہ زمرد کے ننھے ننھے پتھروں سے سجی ہوئی تھی اور انتہائی دلفریب دکھائی دیتی تھی۔ ظاہر ہے پریاں اور پری زاد جتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ اُن کے گھوڑے بھی اتنے ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔

پری زاد آیا تو بڑا سفید گھوڑا بادل دوڑتا ہوا اُس کے پاس پہنچا اور ہنہنا کر اُسے کہنے لگا: ''کیا آپ میری مدد کر دیں گے؟ مجھے آپ سے ایک کام آن پڑا ہے۔'' پری زاد بولا۔ ''کیوں نہیں؟ بڑی خوشی سے۔'' بادل نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ میری ایال کے بال چھوٹے کر دیں اور میری دُم بھی کاٹ کر اتنی چھوٹی کر دیں جتنی آپ کے گھوڑے کی ہے۔'' پری زاد یہ بات سن کر بہت پریشان ہو گیا وہ بولا۔ ''میں یہ کام کسی صورت نہیں کرنا چاہتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ کام ہونے کے بعد تم سخت پچھتاؤ گے۔''

اب بادل کے لہجے میں سختی عود آئی وہ بولا:

''آپ ویسا ہی کریں جیسا میں چاہتا ہوں۔ اصل میں میں یہاں کے تمام گھوڑوں کا سردار بننا چاہتا ہوں۔ اس لیے مجھے ان سب گھوڑوں میں سے خوبصورت بھی لگنا چاہیے۔ تاکہ وہ مجھے فوراً سردار مان لیں۔ مہربانی فرما کر جائیں اور اپنی سب سے تیز اور بڑی قینچی لے کر آئیں اور وہی کریں جو میں آپ کو کہہ رہا ہوں۔'' پری زاد نے اُسے کہا:

''بادل! تم پچھتاؤ گے۔'' یہ کہہ کر وہ قینچی لینے کے لیے روانہ ہو گیا۔

جب وہ واپس آیا تو بادل وہیں ساکت کھڑا تھا وہ بے صبری سے بولا۔

''جلدی جلدی میری ایال کے بال چھوٹے کر دو۔ اتنے چھوٹے کر دو جیسے کسی برش پر لگے ہوئے بال کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے ہر صورت بہت خوبصورت دکھائی دینا ہے۔'' اُس کے کہنے پر پری زاد اُس کی خوبصورت ایال پر قینچی چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ اُس کی ایال کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اب ایال کی جگہ گھوڑے کی پشت پر ننھے ننھے بال خودرو کانٹوں

کی طرح کھڑے تھے۔

بادل بولا: ''اب میری دُم بھی۔'' اور یہ کہہ کر وہ مڑا اور اپنی پشت پری زاد کی طرف کردی تاکہ وہ دُم کاٹ سکے۔ پری زاد کہنے لگا:

''بادل تمہاری اتنی عمدہ اور لمبی دُم ہے۔ میرا دل نہیں کرتا کہ میں اسے کاٹوں۔ مجھے یقین ہے کہ بعد میں تم بھی بے حد پچھتاؤ گے۔'' بادل ناراضگی سے بولا۔

''مہربانی فرما کر ویسا کریں جیسا میں کہتا ہوں۔'' لہٰذا مجبوراً پری زاد کو اُس کی لمبی دُم ایک پھندے میں تبدیل کرنی پڑی جو اُس کی پیٹھ پر لگا ہوا رہ گیا۔ بادل ایک دفعہ پھر تالاب کے پاس گیا اور چاند کی چاندنی میں خود کو ساکن پانی میں دیکھنے لگا اور پھر خوشی سے بولا۔ ''واہ! واہ! میں تو بہت خوبصورت دکھائی دے رہا ہوں۔ اب جب دوسرے گھوڑے میرے ساتھ کھڑے ہوں گے تو بہت بے ڈھبے دکھائی دیں گے۔'' اگلی صبح بھورے اور سیاہ گھوڑے بادل کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ وہ اُسے ایال کے بغیر اور کٹی ہوئی دُم کے ساتھ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ وہ حیرانی سے اُس کے اردگرد دوڑتے رہے اور وہ شاہانہ انداز سے اُن کے درمیان کھڑا رہا۔

وہ فاتحانہ انداز میں ہنہنا کر اُن کو کہنے لگا۔

''بتاؤ میں شاندار لگ رہا ہوں یا نہیں۔ کیا میں تم سب میں سے خوبصورت نہیں ہوں؟ کیا اب بھی تم مجھے اپنا سردار نہیں مانتے؟ یہ بات سن کر سب ہی گھوڑے اُس کی باتوں کی تائید کرنے لگے ماسوائے ایک گھوڑے کے، سب گھوڑوں نے اُسے اپنا سردار مان لیا۔ جس گھوڑے نے اُسے سردار تسلیم نہیں کیا وہ ایک عقل مند اور بوڑھا گھوڑا تھا۔ جو ہنہناتے ہوئے قہقہہ لگا کر بولا:

''تم واقعی شاندار لگ رہے ہو۔ لیکن سردار وہ نہیں ہوتا جو شاندار لگے بلکہ یہ اُس کی ذہانت اور معاملہ فہمی ہوتی ہے جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیا تم واقعی عقل مند ہو؟ نہیں! بادل میں زندگی میں جتنے گھوڑوں کو ملا ہوں۔ تم سب سے بیوقوف ہو۔ دوسرے گھوڑے چاہیں تو تمہیں اپنا سردار بنالیں لیکن تم میرے سردار کبھی نہیں بن سکتے۔'' بادل ناراض ہو کر پوچھنے لگا۔

''کیا وجہ ہے تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟'' بوڑھے گھوڑے نے اُسے جواب دیتے ہوئے کہا:

''گرمیاں آئیں گی تو تمہیں میری بات کی سمجھ آجائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے کھیت میں اُگی ہوئی لمبی گھاس کھانے چلا گیا۔ اب بادل بہت خوش تھا۔

دوسرے گھوڑے اُس کا حکم مان رہے تھے۔ وہ اُس کی تعریفیں اور خوشامد کررہے تھے۔ وہ اُسے بتا رہے تھے کہ اُس کی ایال کتنی خوبصورت لگ رہی ہے اور اُس کی کٹی ہوئی دُم کتنی زبردست لگ رہی ہے۔ وہ بول رہے تھے کہ:

''ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہماری دُمیں اور ایال بھی آپ کی طرح خوبصورت ہوجائے۔'' لہٰذا جب پورے چاند کی رات پری زاد دوبارہ آیا۔ تو تمام گھوڑے اُس کے اردگرد اکٹھے ہوگئے اور اُسے منت کرنے لگے کہ اپنی قینچی اُن کے لیے بھی لے کر آئے۔

''یہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے اور غصے میں بھی آگئے جب بوڑھا گھوڑا دوڑتا ہوا پری زاد کے پاس آیا اور اُسے منع کیا کہ وہ گھوڑوں کی بات مانے۔ پری زاد نے بوڑھے گھوڑے کی بات مانی۔ وہ اپنے خوبصورت گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہوگیا۔ اُسے دلی خوشی ہورہی تھی کہ اُسے کسی گھوڑے کی دُم یا ایال پر قینچی نہیں چلانی پڑی۔ سارے گھوڑے بوڑھے گھوڑے سے بہت ناراض تھے۔ انہوں نے اُسے دولتیاں ماریں اور کاٹنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی جواب میں اتنے غصے سے ہنہنایا کہ باقی گھوڑے اُس سے خوف زدہ ہوگئے۔

بوڑھا گھوڑا اُنہیں کہنے لگا۔

''گرمیاں آنے کا انتظار کرو اور اس کے بعد بھی اگر تمہاری یہ خواہش برقرار رہی کہ تمہاری دُمیں کاٹ دی جائیں۔ تو میں تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ پھر تم مجھے دولتیاں بھی رسید کرلینا اور بے شک کاٹتے بھی رہنا میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا لیکن میری درخواست ہے کہ گرمیوں کا انتظار کرلو۔''

لہٰذا سب نے انتظار کیا اور پھر گرمیاں آگئیں اور وہ اپنے ساتھ لاکھوں مکھیاں بھی لائیں۔ تو گھوڑوں کے اردگرد منڈلانے اور بھنبھنانے لگیں۔ وہ اُن کے ناکوں اور آنکھوں پر بیٹھنے لگیں۔ انہوں نے بے چارے گھوڑوں کو پاگل کردیا۔ وہ ان مکھیوں کے نجات حاصل کرنے کے لیے مسلسل دُمیں ہلانے پر مجبور ہوگئے وہ ان مکھیوں کو ہٹانے کے لیے اپنی ایال کا بار بار استعمال کرتے۔ ماسوائے ایک گھوڑے کے سب ہی ایسا کررہے تھے۔

اور وہ گھوڑا تھا۔ جس کی نہ کوئی ایال تھی اور نہ ہی دُم۔ جس سے وہ ان مکھیوں کو خود سے اُڑا سکتا۔ بادل کی حالت اب ناگفتہ بہ تھی۔ وہ اپنے کانوں اور جسم کو بار بار تھرا رہا تھا کہ کسی طرح ان مکھیوں کو اُڑا سکے۔ لیکن وہ مسلسل اُس پر بیٹھ رہی تھی۔ اب اُسے بوڑھے گھوڑے کی ذہانت پر رشک آرہا تھا۔ اب اُسے شدید خواہش ہورہی تھی کہ کاش اُس کی ایال ہوتی۔ اُس کی لمبی دُم ہوتی بے شک اُن کے بالوں کی کوئی ترتیب نہ بھی ہوتی اب اُس کی حالت اتنی خستہ تھی کہ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر وہ کیا کرے۔ دوسرے گھوڑے بھی دم بخود تھے کہ اُن کا سردار اپنی مکھیاں نہیں اڑا سکتا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر بادل کی تقلید میں اپنوں نے بھی ایال اور دم پر قینچی پھروالی ہوتی تو اُن کا حال بھی اُس جیسا ہی ہوتا۔ وہ بولے:

''تم سردار بننے کے قابل نہیں ہو۔ ہم بوڑھے گھوڑے کو سردار بنائیں گے کیوں وہ جانتا تھا کہ ہمارے لیے کیا صحیح ہے اور کیا نہیں؟''

بقیہ صفحہ نمبر: 60

کارائیل

رمشا جاوید

آلاجا سورج مکھی کے پھولوں کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے سنہری بال دھوپ کی روشنی میں سونے کی مانند چمک رہے تھے اور اسکا گندمی چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''تم بتاؤ سورج مکھی کیا کارائیل نے میرے ساتھ ٹھیک کیا۔؟ اسے معلوم ہے میں دن کی پری ہوں پھر بھی اس نے اپنی بیٹی کی سالگرہ رات میں رکھی اور مجھے دعوت دینے چلی آئی۔'' وہ جب بھی اداس یا غصہ ہوتی تھی سورج مکھی کے پاس آ کر اپنا دل ہلکا کیا کرتی تھی۔

''تم رات میں وہاں جا سکتی ہو آلاجا، مانا کے رات کے وقت تمہاری خوبصورتی ماند پڑ جائے گی، تمہاری نیند بھی خراب ہوگی مگر تم جا سکتی ہو، اور سال میں ایک بار یہ قربانی دے سکتی ہو۔'' سورج مکھی نے پیار سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ آلاجا نے نفی میں سر ہلایا ''اونہو، سورج مکھی! تم کبھی بھی میری حمایت نہیں کرتی ہمیشہ دوسروں کی بات کو ہی ٹھیک کہتی ہو۔'' آلاجا افسردہ ہوگئی ''میں اب سے کبھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔''

لمحوں میں فیصلہ کرنے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور سورج مکھی کے لاکھ پکارنے پر بھی اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ اڑتی گئی، اڑتی گئی یہاں تک کے بادلوں نے اسے سورج مکھی کی نگاہوں سے مکمل طور پر چھپا دیا۔

☆

سورج بادلوں میں منہ چھپائے اب سونے کی تیاریاں کر رہا تھا جب زوئی سورج مکھی کے پاس آ گئی۔ سورج مکھی جو خود بھی نیند کے مارے جھک گئی تھی حیرت سے زوئی کو دیکھنے لگی۔

''خوش آمدید زوئی! سب خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے سورج مکھی!'' زوئی غمزدہ سی بولی۔

''آج رات کارائیل کی بیٹی کی سالگرہ ہے اور وہ جانتی ہے کہ میں برف کی پری ہوں، میرے لیے اس گرم علاقے میں آنا بہت دشوار ہے۔ پھر بھی اس نے یہ دعوت اپنے علاقے میں ہی رکھی۔'' زوئی سراپا احتجاج بنی کھڑی تھی۔

''بری بات ہے زوئی! کارائیل ہر سال جب تمہیں دعوت دیتی ہے تو تمہارے لیے الگ سے ڈھیروں ڈھیر برف سے سجائی جگہ مخصوص کر دیتی ہے۔ پھر تمہیں ہر مرتبہ ہی اس سے شکایت کیوں ہوتی ہے؟'' سورج مکھی دھیمے لیکن ناراض لہجے میں بولی۔

''تم ہمیشہ کارائیل کی حمایت کرتی ہو۔''

زوئی کو بہت غصہ آیا اور وہ بھی سورج مکھی سے سارے تعلقات اور دوستی ختم کر کے چلی گئی۔ سورج مکھی افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی۔

☆

''اٹھو سورج مکھی۔ اٹھو۔'' نیلی آنکھوں والی ہزل سورج مکھی کے آس پاس بے چینی سے منڈلا رہی تھی۔ سورج مکھی نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولی اور اپنی پتیوں کو کھولا۔

''کیا بات ہے ہزل؟'' وہ جمائی لیتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

''تمہیں پتا ہے آج رات کارائیل کی بیٹی کی سالگرہ ہے؟'' ہزل نے اپنی نیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''ہاں مجھے پتا ہے۔'' سورج مکھی نے جواب دیا۔

''اور آج پھر کارائیل نے یہ محفل اپنے علاقے میں رکھی ہے۔ جب کہ اسے معلوم ہے میں پانی کی پری ہوں، اس خشک علاقے میں میرا گلا سوکھ جاتا ہے، میرے پر مرجھا

جاتے ہیں۔ میری آنکھیں بے رونق ہو جاتی ہیں۔'' ہزل اب اپنی شکایتوں کا بنڈل لیے موجود تھی۔

''اوہو ہزل! تمہیں معلوم ہے کارائیل نے تمہارے لیے ایک خوبصورت تالاب بنوا رکھا ہے جہاں تم ہمیشہ بیٹھتی ہو۔'' سورج مکھی اب تھک چکی تھی۔

''پھر بھی ہر سال وہ اپنی من مانی کرتی ہے، میں نے اسے کہا بھی تھا کے وہ اس سال اپنی بیٹی کی سالگرہ میرے سمندر میں آ کر منائے، میں اس کے لیے جزیرہ سجاتی، پانی اور قیمتی پتھروں سے اس کا استقبال کرتی، مگر اس نے میری نہیں سنی۔'' ہزل کی نیلی آنکھوں میں غصہ سمٹ آیا تھا۔ سورج مکھی نے اسے سمجھانے کا ارادہ ترک کیا اور بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں آج بارہ بجے جب دعوت میں شریک ہوں گی تب سب کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کروں گی۔ مجھے امید ہے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔'' ہزل سورج مکھی کی بات پر پرسوچ انداز میں سر ہلاتی اس کا شکریہ ادا کرتی وہاں سے اڑ گئی۔ ابھی سورج مکھی دوبارہ سونے ہی لگی تھی جب ایک دھیمی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''سورج مکھی خالہ کیا آپ میری بات سن سکتی ہیں؟'' اور سورج مکھی حیران رہ گئی۔

''فیری میری تم؟''

''جی میں۔''

''مگر آج تو تمہاری سالگرہ ہے۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' سورج مکھی بہت حیران تھی۔ ''میری ماما کارائیل، وہ ہر سال میری پیدائش والی رات ایک باوقار تقریب رکھتی ہیں لیکن وہ مجھے وقت دینے کے بجائے اپنی دوستوں کو راضی اور مطمئن کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ کیا یہ میرے ساتھ ناانصافی نہیں؟'' فیری میری ڈرتے ڈرتے بول رہی تھی۔

''تو یہ بات ہے'' سورج مکھی نے ایک گہری نظر فیری میری پر ڈالی پھر بولی۔

''یقیناً ناانصافی ہے۔ لیکن کس کے ساتھ یہ بات میں تمہارے کیک کاٹنے سے پہلے سب کے سامنے بتاؤں گی۔''

''کیا آپ میری ماما سے میری شکایت لگائیں گی؟'' فیری ایک دم سے گھبرا گئی۔

''نہیں میری پری! میں انہیں سمجھاؤں گی۔ اب مجھے سونے دو تا کہ میں تمہاری دعوت میں شرکت کر سکوں۔'' سورج مکھی کی بات پر فیری میری اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلی گئی۔

☆

اونچے نیچے درختوں پر سفید، ہری، نیلی اور پیلی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ تمام پھول کھلے ہوئے تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس پریاں اڑ رہی تھیں اور وہیں ایک طرف بڑے سے درخت کے نیچے فیری میری کی سالگرہ کا کیک کاٹا جانا تھا۔ جب سورج مکھی وہاں پہنچی تمام پریوں نے سکھ کا سانس لیا۔ اب یقیناً ان سب کی شکایتیں کارائیل تک پہنچنے والی تھیں۔

''سورج مکھی تمام پریوں کی پسندیدہ تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کے سورج مکھی کا بیج بونے والی ملکہ پری تھی جس سے سب محبت کرتے تھے اور وہی سب کے مسائل کو حل بھی کیا کرتی تھیں۔ مگر ایک رات طوفانی بارش ہوئی جس میں ملکہ پری بیمار ہو گئی اور یہ ہی بیماری ان کی موت کا سبب بنی۔ شروع شروع میں پریاں اپنی ملکہ کی باتوں کو یاد کر کے اچھی زندگی گزار رہی تھیں مگر اچانک ہی ان کے درمیان فاصلے پیدا ہونے لگے۔

''سورج مکھی چپ ہوئی تو تمام پریاں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگیں، ننھی پریاں بھی منہ کھولے آنکھیں پھاڑے سورج مکھی کو دیکھ اور سن رہی تھیں۔

''اور فاصلوں کے پیدا ہونے کی وجہ اُن کا غصہ تھا۔ وہ نرم دل تھی، خوش اخلاق تھیں، ملنسار اور مددگار تھی، اس لیے شیطان ان کے اوپر حاوی نہیں ہو پا رہا تھا تب شیطان نے اپنے قدم جمانے کے لیے ان کے اندر غصہ کو پیدا کیا اور غصہ نے ان کے اندر انا اور ضد کو ابھارا، ان سب کو لگنے لگا کہ وہ سب ٹھیک ہیں اور دوسرے سب غلط۔ یہ ہی وجہ تھی کے وہ فاصلے بڑھا رہی تھی اور محبتوں کو گنوا رہی تھی۔ محبت، خوشیاں اور سکون سب جا رہا تھا۔'' سورج مکھی کی پیلی پتیاں اس کے اُس کے آنسوؤں سے بھیگنے لگی۔

کارائیل بھی سر جھکائے کھڑی تھی جب کے باقی سب شرمندہ شرمندہ سی سورج مکھی کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کر رہی تھیں جس نے ان کا نام لیے بغیر انہیں شرمندہ کیے بغیر بہت اچھے طریقے سے ان سب کو شیطان کے شر سے بچا لیا تھا۔ ☆

بقیہ: گھوڑوں کا سردار

پھر انہوں نے بوڑھے گھوڑے کو اپنا سردار بنا لیا۔ بوڑھا گھوڑا بہت خوش تھا لیکن اُس نے یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ عقل مند بھی تھا اور نیک دل بھی۔ جب اُس نے بادل کی حالت دیکھی جو تنہا بے چارگی کے عالم میں کھڑا تھا اور اپنی مکھیاں بھی نہیں اُڑا سکتا تھا۔ اُس نے دوسرے گھوڑوں کو کہا کہ اُس کے اردگرد نزدیک ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ کھڑے ہو گئے اور اُن کی اردگرد دلتی ہوئی دُموں سے بادل کے جسم سے بھی مکھیاں اُڑنے لگیں۔ وہ سب کا بہت شکر گزار تھا۔

چوہدری الیاس کے کھیتوں میں اب بھی وہ سولہ گھوڑے موجود ہیں۔ لیکن تم اُن میں سے کوئی گھوڑا ایسا نہیں دیکھو گے جس کی ایال یا دُم کٹی ہوئی ہو اب بادل کی ایال کے بال دوبارہ لمبے ہو گئے ہیں اور اُس کی دُم بھی پہلے جتنی ہو گئی ہے کیونکہ اُسے سبق مل چکا ہے۔ کہ ''خدا تعالیٰ نے جو جاندار جس طرح بنایا ہے اُسے اپنی حکمت سے بنایا ہے۔''

☆.....☆.....☆

محسن ابڑو قادری

حسان

حسان بچپن ہی سے ذہین، فتین بچہ تھا۔ اسکول میں ہمیشہ وہ ٹاپ کرتا، دوسرے بچے حسان کی کارکردگی پر رشک کرتے۔ اب حسان میٹرک کی کلاس میں پہنچ چکا تھا۔ سالانہ بورڈ کے امتحانات ابھی ہوئے نہیں تھے، مگر حسان کے ہم جماعتی شہر بھر کے اعلیٰ سے اعلیٰ سینٹرز میں داخلے کی تگ و دو میں لگ گئے کہ بورڈ کے امتحانات سر پر ہیں، مگر ہماری تیاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ تو سینٹرز والے ہی ہماری بہترین تیاری کروالیں گے جس سے ہم اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کر پائیں گے۔ مختلف سینٹرز میں طلبا و طالبات کی سہولت پیش نظر اسٹڈی گروپس تشکیل دیے گئے تھے، ایک گروپس میں آٹھ بچے شامل تھے۔ چھے ماہ کا کورس تھا جس کی کل ملا کر فیس چالیس، پچاس ہزار تک تھی جس میں ایڈوانس فیس، ٹوئس وغیرہ سب شامل تھے۔

اس کے برعکس حسان نے کسی بھی سینٹر میں داخلہ نہیں لیا۔ اس عمل پر حسان کے رشتے دار سمیت ہم جماعتی بھی حیران رہ گئے کہ یار حسان بورڈ کے امتحان کو معمولی سا سمجھ رہا ہے مگر اسے کیا معلوم کہ یہاں (بورڈ کے امتحانات) میں کامیابی کے لیے کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، دن رات ایک کرنا پڑتا ہے، حسان کو اپنا تکبر لے ڈوبے گا دیکھ لینا۔ کسی نے کہا حسان متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے وہ کہاں ہماری (امیروں) طرح چالیس، پچاس ہزار کا خرچہ برداشت کر سکتا ہے۔ وہیں حسان کا دیرینہ دوست ابراہیم بھی موجود تھا۔ جب اس نے یہ سب باتیں سنیں تو اس سے رہا نہیں گیا اور ایک ایک کو اس نے یوں جواب دیا کہ:

''یار تمہیں دوسروں کی فکر کیوں کھائے جا رہی ہے؟ حسان سینٹر میں داخلہ لے یا نہ لے یہ اس کا ذاتی فیصلہ ہے، تم بلاوجہ اس کی غیبت کیوں کر رہے ہو اور جس انسان کو کسی چیز کا علم نہ ہو تو وہاں خاموشی میں ہی عافیت ہے۔ ورنہ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ حسان کے والدین ہم سب میں مالی اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ اب وہ حسان کو خود پر اتنا یقین ہے کہ وہ ذاتی مطالعے سے بورڈز کے امتحانات میں بھی میدان مار لے گا، تو اس کے والدین خوامخواہ کے چالیس، پچاس ہزار کیوں ضائع کریں؟ اور ہاں تم (شاکر) تو میرا منہ نہ کھلواؤ تو بہتر ہوگا تم نے تو آٹھویں جماعت کے لیے بھی ''باب العلم انسٹیٹیوٹ'' میں داخلہ لیا تھا پھر وہاں سے پڑھ کر تم نے کون سے تیر مار لیے ہم سب بہتر جانتے ہیں، بورڈ کے امتحانات بھی دور نہیں ہیں پانچ، چھے ماہ کی بات ہے پھر دیکھ لیں گے کون کتنے پانی میں ہے، قبل از وقت بلند بانگ دعوے کرنا مہذب لوگوں کا شیوہ نہیں۔''

آہستہ آہستہ دن گزر گئے اب صرف سات دن رہ گئے تھے۔ امتحانات سے پہلے پریکٹیکل ہونے تھے، پریکٹیکل کا سنتے ہی حسان کے نالائق دوستوں کی چیخیں نکل گئیں گویا

کسی نے ان کی دُم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ مجھے کو بائیولوجی کا پہلا پریکٹیکل تھا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جن جن لڑکوں نے حسان کے خلاف زہر اگل کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی، وہ سب کے سب فیل ہوگئے۔ اسجد جو خود کو وقت کا آئن سٹائن سمجھ رہا تھا اس سے پریکٹیکل میں مینڈک کی تصویر نہیں بن سکی۔ اسی طرح فرقان سے امیبا کے لائف سائیکل کے بارے میں دو، تین سوالات پوچھے گئے تو وہ بغلیں جھانکنے پر مجبور ہوگیا۔ اب آخری باری سلمان کی تھی جس سے جب پیرامیشیم کے متعلق کچھ پوچھا گیا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا جس کا پیرامیشیم سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ حسان کے سب دوست جب فل فلاپ ہوگئے تو ان کے والدین نے سوچا کہ حسان اور اس کے والدین سے اس کی ذہانت کے بارے میں کچھ پوچھا جائے کہ آپ کا بیٹا کارکردگی سے پہاڑ تک ہلا دیتا ہے ہمارے بچوں سے تو روڑا تک نہیں ہلتا۔

ان اوباش لڑکوں نے حسان اور اس کے شریف النفس سرپرست اعلیٰ (والدین) کے متعلق پروپیگنڈے کیے کہ: ''وہ پیسوں سے حسان کو کامیابی دلواتے ہیں، اس کامیابی کے پیچھے حسان کا کوئی کمال نہیں اور تو اور یہ تک کہا کہ اس کے والدین بڑے غرور و تکبر کا پیکر ہیں۔ وہ ایرے غیرے نتھو خیرے سے ملنا تک پسند نہیں کرتے۔ حسان خود بہت بڑا بدتمیز بداخلاق لڑکا ہے۔'' والدین نے یہ سب من گھڑت باتیں سن کر کہا۔

''اوہ اچھا یعنی دال میں کچھ کالا ہے؟'' چلو آؤ دیکھتے ہیں پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا، مگر ایک بات یاد رکھنا تم میں سے کسی کی ایک بات بھی جھوٹی نکلی تو سوچ لینا پھر ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' سب لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا:

''ہاں ہاں پھر جو چور کی سزا وہ ہماری سزا۔''

ان ہی لڑکوں میں سے ایک لڑکا (عاطف) بول اٹھا:

''ارے! کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑا مار رہے ہو اپنی ایک بات میں بھی ذرا برابر صداقت نہیں، پھر تم اتنی بے باکی سے جھوٹ بول رہے ہو، جھوٹ بولنے پر اگر آسکر ایوارڈ ملتا، تو ہم ضرور اس کے حق دار ٹھہرتے۔''

دوسرے دن شام کو جب حسان مطالعے میں مشغول تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہے کہ سلمان، فرقان، اسجد، عاطف کے والدین سب کے سب ان کے ہاں آئے ہیں۔ حسان نے ان سب کو سلام کیا پھر بڑی گرم سے مرد حضرات سے گلے ملا۔ ان سب کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور فوراً ہی اپنے والدین کو اندر سے بلا لایا۔

حسان کے والد ممتاز صاحب اور ان کی زوجہ ماہین نے سب کا خیر مقدم کیا۔ جلد ہی اپنی بیٹیوں سے پرتکلف چائے بنانے کے لیے کہا۔ حسان نے سب کا بہترین طریقے سے تعارف کروایا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب میرے حاسدین کے والدین ہیں، مگر حسان کی تربیت نے اسے اس چیز کی اجازت نہیں دی، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ برائی کا بدلہ برائی نہیں وہ صلح رحمی کرنے والا انسان تھا، اس نے درگزر سے کام لیا کہ وہ حاسدین اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان لڑکوں کے والدین دل ہی دل میں کہنے لگے کہ یار ہمارے بچوں نے ان کے بارے میں جو نقشہ کھینچا تھا ایسا تو یہاں کچھ نہیں۔''

ان والدین نے حسان سے پوچھا۔

''بیٹا آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟''

حسان: ''جی الحمدللہ بس والدین کی دعاؤں، اساتذہ کی محنت اور میری کوشش ہی میری کامیابی کا وسیلہ ہے۔ میں دن میں لازمی طور پر چار، پانچ گھنٹے مطالعہ کرتا ہوں، ہر کام مقررہ وقت پر کرتا ہوں، اب آپ خود اندازہ لگائیں آپ کی آمد سے قبل میں پڑھ لکھ رہا تھا، مگر اب میں آپ کے ساتھ بیٹھا ہوں۔''

پھر والدین سے پوچھا گیا:

''آپ کا بیٹا (حسان) کھیلتا وغیرہ نہیں ہے؟'' اس کے مشاغل میں کیا کیا شامل ہے۔ حسان کے والدین نے جواب دیا:

''نہیں ہمارا بچہ عام بچوں کی طرح کھیل کود سب میں حصہ لیتا ہے، مگر اس سے اپنی پڑھائی میں فرق نہیں آنے دیتا۔ ہمارا بیٹا کرکٹ بہت شوق سے دیکھتا ہے اور کھیلتا بھی ہے۔ اس کے پسندیدہ کھلاڑیوں میں بابر اعظم اور شاداب سرفہرست ہیں۔ ہاں فضول مشاغل جیسے ٹک ٹاک پر ناچ گانا کرنا، پب جی گیم کے قریب بھی حسان نہیں بھٹکتا۔ یہ مشاغل نوجوان نسل کے کسی کام کے نہیں، اس سے وقت، توانائی، پیسا، سب کچھ ضائع ہوتا ہے اگر خدا نخواستہ آپ کی اولاد بھی ان بے ہودہ مشاغل میں جکڑی ہوئی ہے تو فوراً سخت ایکشن لے کر ان کی لازمی اصلاح کریں ورنہ بات بہت آگے تک بڑھ جائے گی۔ بس انھیں گھر میں لازمی چار، پانچ گھنٹے پڑھنے کے لیے بٹھائیں۔ ذاتی مطالعے میں ہی کامیابی مضمر ہے، سینٹرز والوں کی اکثریت علم کی دشمن ہوتی ہے۔ ایک ایک بچے سے کمانا اور بچے پر انفرادی محنت بالکل نہ کرنا، یہ کہاں کا انصاف ہے۔ ہاں سینٹرز والے صرف تیاری وہ بھی برائے نام اور نوٹس کی بھرمار ضرور کریں گے، باقی بچے کی کامیابی کی ضمانت وہ کبھی نہیں دیں گے۔ وہ نوٹس تو دے سکتے ہیں مگر اسے گھول کر پلانے سے تو وہ رہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر آج ہی سے اپنی اولاد پر بھرپور توجہ دیں۔ پیار محبت سے سمجھائیں کہ بیٹا آپ مستقبل کے معمار ہیں، آپ محنت کریں، عزت دولت شہرت سب آپ کے قدم چومے گی، کامیابی کسی کے باپ کی میراث نہیں جس کی محنت اس کا سب کچھ اب خواہ وہ ہمارا بیٹا حسان ہو یا آپ کا اسجد۔''

ان لڑکوں کے والدین کو بڑا افسوس ہوا کہ ہم نے خوامخواہ میں چالیس، پچاس ہزار پانی کی طرح بہا دیے، مگر اب بھی وقت ہے ہم اپنے بچوں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا کر انہیں راہ راست پر لائیں گے اور بھرپور محنت، دل جمعی کے ساتھ پڑھائی کروا کر حسان کی طرح کامیاب طالب علم بنائیں گے۔'' ☆

نیلی پری

مہوش اسد شیخ

گرمیوں کے دن تھے۔ احمد اور عائشہ کی امی چھت پر بستر بچھا کر انہیں جلدی سونے کی تاکید کرتی ہوئی خود نیچے جانے لگیں۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

احمد نے پیچھے سے پکارا۔

''کچن میں رات کے کھانے کے برتن رکھے ہیں۔ میں ذرا دھو کر آتی ہوں۔''

انہوں نے مڑ کر جواب دیا۔ ''ہمیں ڈر لگے گا۔''

احمد جھٹ سے بولا۔

''بہادر بنو، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی آپ کے ابو عشاء کی نماز پڑھ کر آ چکے ہیں۔ وہ اوپر آتے ہی ہوں گے۔''

وہ دونوں کی طرف مسکراہٹ اچھال کر نیچے چلی گئی۔

''عائشہ! نیند آ رہی ہے؟''

احمد نے منہ بسورے بیٹھی عائشہ سے پوچھا۔

''نہیں'' اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

''بہت بوریت ہو رہی ہے اور نیند بھی نہیں آ رہی۔ ابو جان پتہ نہیں کب اوپر آئیں گے، چلو کچھ کھیلتے ہیں۔''

احمد کے کہنے پر عائشہ خوشی سے اچھل پڑی۔

''چلو پکڑن پکڑائی کھیلتے ہیں۔''

عائشہ نے آنکھیں گھمائیں۔

''نہیں! ہمارے قدموں کی آواز نیچے تک جائے گی، امی ناراض ہوں گی۔'' احمد نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''تو پھر کیا کریں؟'' عائشہ ایک بار پھر منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

''چڑیا اڑی کھیلتے ہیں۔'' احمد نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے مشورہ دیا۔

''مجھے یہ کھیل پسند نہیں۔'' عائشہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''چلو پھر کچھ اور سوچ لیتے ہیں۔'' احمد نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''بھیا وہ دیکھو!'' عائشہ نے چونکتے ہوئے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

احمد نے دیکھا آسمان پر نیلی روشنی دکھائی دے رہی تھی جو کہ بہت تیزی سے نیچے کی طرف آ رہی تھی۔

''شاید آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ گیا ہے۔''

احمد نے اپنے تئیں اندازہ لگایا۔ روشنی ان کی چھت پر آ پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک پری کا روپ دھار گئی جس کی کمر پر خوش نما پنکھ دکھائی دے رہے تھے۔

عائشہ سہم کر احمد کے پیچھے چھپ گئی۔ احمد بھی ڈر رہا تھا مگر وہ بہن کا محافظ بن کر کھڑا رہا۔

''پیارے بچو! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نیلی پری ہوں، بہت دور

بادلوں میں رہتی ہوں۔ روزانہ رات کو نیچے اترتی ہوں اور اچھے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ اپنے والدین کا کہنا مانتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟''

نیلی پری نے سوالیہ نگاہ دونوں پر ڈالی تو دونوں زور زور سے سر ہلانے لگے۔

''جی بالکل! ہم اپنے والدین کا ادب کرتے ہیں، ان کی سب باتیں مانتے ہیں، وقت پر سارے کام کرتے ہیں، استاد کا بھی احترام کرتے ہیں، جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں اور ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔''

احمد پرجوش انداز میں اپنی باقی خوبیاں بھی گنوانے لگا۔ نیلی پری اس کی معصومیت پر مسکرادی۔ ''چلیں ٹھیک ہے آج سے ہم دوست ہیں۔''

نیلی پری نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا جسے دونوں نے گرم جوشی سے تھام لیا۔

''چلو پکڑن پکڑائی کھیلتے ہیں۔''

نیلی پری نے دونوں کے گال پر پیار سے چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے بھاگنے کی آواز نیچے تک جائے گی، امی خفا ہوں گی۔''

عائشہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''بھاگ کون رہا ہے؟ ہم تو اڑتے ہوئے کھیلیں گے پکڑن پکڑائی.....'' نیلی پری نے اپنے پنکھ کے درمیان سے دونوں کے لئے چمکیلے پنکھ نکالے اور ان کی طرف بڑھا دیئے جو دونوں نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے پہن لئے، پہنتے ہی ان کے پاؤں زمین سے اوپر ہوا میں اٹھتے گئے۔ پہلے تو انہیں ڈر لگا مگر پری کے تسلی دینے پر دونوں جلد ہی سنبھل گئے، اب دونوں کو بہت مزا آرہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے انہیں سیڑھیوں کی جانب سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ''لگتا ہے کوئی اوپر آرہا ہے۔'' احمد نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''اچھا بچو! اب میں چلتی ہوں، کل پھر آؤں گی۔''

پری فوراً ہی جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

''پکی بات ہے نا؟ آپ نے کہا ہے کل پھر آؤں گی۔''

عائشہ نے معصومیت سے پوچھا تو پری مسکرادی اور سر اور ہاتھ ہلاتے ہوئے آسمان کی طرف اڑگئی۔ دونوں بچے پری کے جاتے ہی تیزی سے بستر پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر کے سوتے بن گئے۔ کھیلنے کی وجہ سے وہ تھک بھی گئے تھے سو اگلے ہی لمحے گہری نیند سو گئے۔

نیلی پری روز آتی اور بچوں کے ساتھ کھیلتی۔ بچے اب رات کا کھانا کھاتے ہی چھت پر چلے آتے۔ ان کی امی بہت خوش تھیں کہ بچوں کو اب بار بار سو جانے کا نہیں کہنا پڑتا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ ایک دن ان کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

''عائشہ اور احمد بیٹا! ادھر آؤ، میرے ساتھ تھوڑا کام کروادو۔''

امی نے انہیں اوپر جاتے دیکھا تو آواز دے کر روک لیا۔

''امی ہمیں بہت نیند آرہی ہے، کام کرنے کی بالکل ہمت نہیں ہے۔''

دونوں نے بہانہ بنایا اور اوپر بھاگ گئے۔

''بھیا نیلی پری ابھی تک نہیں آئی۔ کتنا وقت گزر چکا ہے۔''

عائشہ انتظار کرتے، کرتے تھک چکی تھی اور اب رو دینے کو تھی۔ دونوں مایوس ہو کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ وہ روزانہ انتظار کرتے رہے مگر پری نہ آئی۔

''پری بہت گندی ہے، روز آنے کا وعدہ کیا تھا مگر وعدہ پورا کرنا بھول گئی۔''

ایک دن عائشہ منہ بنا کر بولی۔

''ہوسکتا ہے وہ بیمار ہوگئی ہو۔'' احمد نے بہن کو تسلی دینا چاہی۔

''اللہ جی! ہماری پری کو جلدی سے ٹھیک کردیں تاکہ وہ ہمارے ساتھ کھیلنے آسکے۔''

عائشہ نے اسی وقت ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

''وہ دیکھو نیلی روشنی! ہماری پری آگئی۔'' احمد زور سے چلایا۔

نیلی پری جو کہ کہیں اور جارہی تھی، دونوں کے پکارنے پر ان کی چھت پر اتر آئی۔

''ہاں بولو! کیا بات ہے؟'' وہ ناراض لہجے میں بولی۔

''پیاری پری آپ کہاں چلی گئی تھی؟ اتنے دن ہوگئے آپ کا انتظار کرتے ہوئے۔''

عائشہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''میں صرف اچھے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوں جو اپنے والدین کا کہنا مانتے ہیں، کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور جھوٹ سے دور بھاگتے ہیں۔'' پری نے ناراضگی سے کہا۔

''ہم بھی اچھے بچے ہیں۔'' عائشہ روہانسی ہوگئی۔

''نہیں بالکل بھی نہیں! آپ پہلے اچھے بچے تھے مگر اب آپ اپنی امی کے ساتھ جھوٹ بھی بولتے ہو اور ان کا کہنا بھی نہیں مانتے۔ وہ بیمار ہوں تو کام کاج میں ان کی مدد بھی نہیں کرتے۔'' پری نے انہیں آئینہ دکھایا تو دونوں شرمسار ہوگئے۔

''ہمیں معاف کردو پیاری پری! ہماری کوشش ہوتی تھی ہم جلد از جلد اوپر آجائیں آپ کے ساتھ کھیلنے کے لیے، بس اسی وجہ سے ہم اپنی امی کی نافرمانی کرتے رہے اور ان سے جھوٹ بھی بولتے رہے۔ پلیز ہمیں معاف کردو، آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اب ہم پہلے اپنی امی کے ساتھ کام کروائیں گے، پھر کھیلیں گے۔'' دونوں نے کان پکڑ کر معافی مانگی تو نیلی پری کو ان پر بہت پیار آیا۔ اس نے مسکرا کر دونوں کو سینے سے لگالیا۔

''اچھا اب کافی وقت ہوچکا ہے، تم دونوں سو جاؤ۔ میں کل آؤں گی اور آپ کے لئے گفٹ بھی لاؤں گی۔ آپ نے اپنی غلطی فوراً تسلیم کرلی اور معافی بھی مانگ لی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔'' نیلی پری ہاتھ ہلاتے ہوئے ہوا میں اڑگئی۔

نیلی پری کے لوٹ آنے پر دونوں بہت خوش تھے اور دل ہی دل میں آئندہ کوئی برا کام کرنے اور کسی کا دل دکھانے سے باز رہنے کا وعدہ کررہے تھے۔☆

لطیفے

اندھا دھند

ایک اندھا شخص تھانے میں جا کر کہنے لگا:

''سر! مجھے پولیس میں بھرتی کر لیں۔''

تھانے دار نے جواب دیا:

''بھئی! تم تو اندھے ہو!''

وہ شخص دوبارہ بولا:

''کوئی بات نہیں، آپ مجھے اندھا دھند فائرنگ کے لیے رکھ لیں۔''

گیدڑ

ایک دوست (دوسرے سے): ''ہمارے گاؤں کی بلیاں اتنی پڑھی لکھی ہیں کہ وہ آپس میں اُردو میں بات کرتی ہیں۔ میں آؤں..... میں آؤں۔''

دوسرا دوست: ''اس میں حیرت والی کیا بات ہے؟ ہمارے گاؤں کے گیدڑ تو انگریزی بھی سیکھ چکے ہیں۔ ہر وقت ہاؤ..... ہاؤ..... ہاؤ آر یو کرتے رہتے ہیں۔''

گول ہے

ایک سادہ لوح آدمی نے پہلی بار فٹ بال میچ دیکھا۔ کئی کھلاڑیوں کو ایک فٹ بال کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے ایک آدمی سے پوچھا:

''بھائی صاحب! یہ سب کیا کر رہے ہیں۔''

آدمی نے جواب دیا: ''گول کر رہے ہیں۔''

سادہ لوح آدمی فٹ بال کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا: ''ہائیں! یہ تو پہلے ہی گول ہے بھائی!''

ڈاکٹر اور مریض

مریض (ڈاکٹر سے): ''مجھے دور کی چیزیں نظر نہیں آتیں۔''

ڈاکٹر: ''ذرا آسمان پر دیکھو، وہ کیا ہے؟''

مریض: ''چاند ہے''

ڈاکٹر: ''اب اس کے آگے کیا دیکھنا چاہتے ہو بھائی!''

کارتوس

ایک لڑکا اپنے دوست سے کہنے لگا:

''یار! میرے ابا جب گانا گاتے ہیں تو آسمان سے اُڑتی ہوئی چڑیاں نیچے گرنے لگتی ہیں۔''

دوست نے جوب دیا:

''کیوں بھئی؟ کیا تمہارے ابا منہ میں کارتوس رکھ کر گاتے ہیں؟''

مُرغا

ایک پہلوان اپنی طاقت پر فخر کرتے ہوئے بولا:

''میں ایک وقت میں دو آدمیوں کو اُٹھا سکتا ہوں۔''

دوسرا آدمی: ''لو! تم سے تو ہمارا مُرغا اچھا ہے جو صبح صبح پورے محلے کے لوگوں کو اُٹھا دیتا ہے۔''

بی بی بطخو بڑی سیانی

پیارے بچو! آپ بہت ذہین ہیں نا! تو لیجیے اب آپ سے بی بی بطخو پہیلیاں پوچھیں گی۔
یاد رہے کہ ان پہیلیوں کے جوابات میگزین میں ہی موجود ہیں جو آپ کو خود تلاش کرنے ہوں گے۔

وہ خود چکھے اور نہ کھائے
سب میوے اوروں کو کھلائے

ہے رفتار اس کی گفتار
کہہ دے باتیں کئی ہزار

اس کی بازو ہیں نہ ٹانگیں
پھر بھی مارے خوب چھلانگیں
اُچھلا، کودا، دوڑ کے آیا
سب نے مار کے پرے بھگایا

اُدھر سے گئی یا ادھر سے گئی
نہیں ہے رُکتی جدھر سے گئی

یا وہ ہوتا ہے یا وہ ہوتی ہے
بیٹھی مالن جسے پروتی ہے

آتی ہے یا جاتی ہے
کب وہ پر لگاتی ہے

جان نہیں پر دھڑکے دل
ہاتھ لگے تو اس سے مل

کھڑا ہے بس صبح و شام
چلنا پھرنا اُسے حرام

آپ کے ساتھ وہ چلتا جائے
کوئی پکڑ کر اُسے دکھائے

نوٹ: جوابات اسی شمارے میں تلاش کیجیے۔

شیف ثانی

سمیعہ علی

پیارے بچو! ثمر گھر میں اکیلے بور ہو رہی تھی۔ ثمر کو اکیلا بور ہوتے دیکھ کر ثمر کی گڑیا ثانی نے اس کی بوریت کو دور کرنے کے لیے ثمر کو مشورہ دیا کہ ثمر اپنی سہیلیوں چندا اور رانی کو گھر پارٹی پہ بلائے اور آپ تو جانتے ہیں کہ ثمر کی گڑیا ثانی ایک بہترین شیف ہے، جو بڑے مزے مزے کے پکوان بناتی ہے۔ شام کو جب چندا اور رانی ثمر کے گھر آئیں تو انہوں نے ثمر سے ثانی کا پوچھا۔

''ثمر ہماری شیف ثانی آج ہمیں پارٹی میں کیا پکا کر کھلائیں گی؟''

''تلی ہوئی مچھلی لیکن صرف پکا کر کھلائیں گی نہیں بلکہ پکانا بھی سکھائیں گی۔'' چندا اور رانی کی بات سن کر شیف ثانی جلدی سے جواب لیے حاضر ہوئی۔

''چلو تم لوگ میرے ساتھ کچن میں آؤ تاکہ میں تمہیں مچھلی تلنا سکھاؤں۔ شیف ثانی کے حکم پر وہ دونوں ثمر کے ساتھ کچن کی جانب بڑھیں۔ ثانی نے جلدی سے مچھلی تلنا شروع کی اور ساتھ ہی ان تینوں کو بتاتی بھی گئی۔

سب سے پہلے ہم نے لینی ہے ایک مچھلی اور اسے اچھے سے دھونا ہے۔ پھر ایک پیالہ لے کر اس میں مچھلی مسالا، پسا ہوا لہسن اور لیموں ڈال کر پیسٹ بنانا ہے اور اس پیسٹ کو مچھلی پر اچھے سے لگا کر ۳۰ منٹ تک رکھ دینا ہے۔

''تیس منٹ تک! پھر تب تک ہم کیا کریں گے؟ رانی حیران ہوئی۔''

''تب تک ہم بنائیں گے املی کی چٹنی جس کا چٹخارا مچھلی کو اور بھی زیادہ مزیدار بنائے گا۔''

''پھر وہ بھی جلدی سے بنانا سکھا دو۔'' چندا نے فرمائش کی تو ثانی نے چٹنی بنانا شروع کی۔ ''سب سے پہلے ہم نے پودینے کو دھو کر خشک کرنا ہے، پھر اس کی پتیوں کو گرائنڈر میں ڈال کر پیسنا ہے۔ پسے ہوئے پودینے میں املی کا گودا، نمک، کالی مرچ اور چینی ملا کر مزید گرائنڈ کرنا ہے۔ خوب مکس ہو جانے پر نکال کر شیشے کی پیالی میں ڈال لینا ہے۔ شیف ثانی نے کہتے ہی چٹنی شیشے کی پیالی میں ڈالی۔''

''چٹنی گاڑھی ہے تھوڑا سا پانی ملانا پڑے گا۔'' ثانی نے چٹنی میں ایک کپ پانی ملایا اور مزیدار املی کی چٹنی تیار ہو گئی۔ ''چلو اب ہم اسے فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیتے ہیں اور مچھلی تلتے ہیں۔'' ثانی نے چٹنی فریج میں رکھ کر مچھلی نکالی اور مچھلی پہ لگے کس کی مدد سے چاقو سے مچھلی کے ٹکڑے کیے ساتھ ہی چولہے کی ہلکی آنچ پہ پین چڑھا کر اس میں تیل ڈالا۔ تیل گرم ہوتے ہی ثانی نے اس میں مچھلی کے ٹکڑے ڈالنے شروع کیے۔ ''جیسے ہی مچھلی سنہرا پن اختیار کرے تو سمجھو وہ پک گئی اور ہماری مچھلی بھی پک گئی ہے۔'' ثانی نے چند منٹ بعد مچھلی کو ٹرے میں نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت ہی آسان طریقہ تھا۔'' چندا نے مچھلی پر چاٹ مسالا چھڑکتی ثانی سے چہک کر کہا۔

''اُف! تمہاری تلی ہوئی مچھلی اور املی کی چٹنی دیکھ کر میرے منہ میں تو پانی آ رہا ہے۔'' رانی نے بھی لقمہ دیا۔ ''ابھی تو تم دونوں میرے ہاتھ سے تلی ہوئی مچھلی اور چٹنی کھاؤ گی لیکن مجھے امید ہے میرے بتائے گئے آسان طریقے کی مدد سے گھر پر تم خود ہی تل کر کھاؤ گی۔'' ثانی نے یہ کہہ کر مچھلی کا ٹرے اور چٹنی کا پیالہ ثمر اور اس کی سہیلیوں کے حوالے کیا۔ مچھلی کھانے کے فوائد

☆.....☆.....☆

مختصر کہانیاں

بھالو میاں کی چاکلیٹ

ایمن صغیر

ایک بہت بڑے اور خوبصورت جنگل میں تمام جانور بہت اور اپنائیت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے اگر کسی کو کوئی مشکل درپیش ہوتی تو سب ہی وہ مشکل مل کر حل کر لیتے۔ اس جنگل میں ایک بھالو میاں بھی رہتے تھے جو بہت نخرے والے تھے کسی سے بھی بات نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی کے ساتھ کھیلتے تھے۔ بھالو میاں کو چاکلیٹ کھانے کا بہت شوق تھا وہ مزے مزے کی چاکلیٹ لاتے تھے، اکیلے ہی ایک اونچے درخت پر بیٹھ کر چاکلیٹ کھا لیتے تھے اور کسی کو بھی نہیں دیتے تھے۔ سب جانوران سے اسی بات پر ناراض ہوتے تھے کہ وہ چاکلیٹ بانٹ کر نہیں کھاتے مگر وہ کسی کی بھی بات نہیں سنتے تھے۔

☆

''بھالو میاں تمہارے پاس تو یہ چاکلیٹ بہت مزے کی ہے مجھے بھی تھوڑی سی دو نا۔'' بھالو میاں جو آرام سے درخت پر بیٹھے بچا کھچا چاکلیٹ کھانا شروع ہی کرنے والے تھے بندر لالا کی آواز پر چونکے۔

''کیوں یہ میری ہے میں کیوں دوں تمہیں؟'' بھالو میاں نے غصے سے کہا۔

''ارے بھالو میاں! غصہ کیوں کرتے ہو تھوڑی سی چکھا دو اگر اچھی ہوئی تو میں بھی لے آؤں گا۔'' بندر لالا نے دوستانہ انداز میں کہا۔

''جاؤ تم یہاں سے یہ میری چاکلیٹ ہے میں نہیں دوں گا۔'' بھالو میاں نے منہ بناتے کہا تو بچارے بندر لالا اپنا سا منہ لیے درخت سے نیچے اتر آئے۔

''ہوں بڑے آئے میری چاکلیٹ کھانے والے بھالو۔'' میاں بڑبڑائے اور مزے سے چاکلیٹ کھانے لگے۔

''کیا ہوا بندر لالا اداس کیوں بیٹھے ہو؟'' مورنی نے جب بندر لالا کو سب سے الگ بیٹھے دیکھا تو اُس کی پاس آ کر پوچھا۔

''مورنی آپا! آج بھالو میاں نے مجھ سے بہت بری طرح بات کی مجھے بہت برا لگا'' بندر لالا نے افسردگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بندر لالا تم دل چھوٹا مت کرو بھالو میاں تو ایسے ہی بات کرتے ہیں سب سے آؤ ہم کھیلتے ہیں'' مورنی نے کہا تو بندر لالا سر اثبات میں ہلاتے سب کے پاس چلے گئے جہاں بلی، چڑیا، ہاتھی، ہرن اور تتلیاں چھپن چھپائی کھیل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بندر لالا سب کچھ بھول بھال مزے سے کھیل میں لگ گئے تھے۔

☆

بندر لالا صبح صبح سیر کرنے نکلے تھے وہ روز ہی صبح سیر کے لیے جاتے تھے ابھی وہ سیر سے لوٹ رہے تھے جب ایک جگہ سب جانوروں کا مجمع دیکھا تو جلدی جلدی دوڑے چلے آئے۔ ''کیا ہوا ہے سب ٹھیک تو ہے؟'' بندر لالا نے بلی سے پوچھا۔ ان کی آواز پر سب نے بندر لالا کو دیکھا۔ سب کے بیچ میں بھالو میاں بھی بیٹھے تھے جو رو رہے تھے۔ بندر لالا کو دیکھ کر غصے سے بولے:

''تم نے میری چاکلیٹ کھائی وہ واپس کرو۔'' بھالو میاں کی بات سن بندر لالا حیران رہ گئے۔

''میں نے نہیں کھائی مجھے نہیں معلوم؟''

''تم جھوٹ بول رہے ہو کل تم ہی مانگ رہے تھے میں نے نہیں دی تو تم نے چپکے سے لے لی رات کو'' بھالو میاں نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں نے نہیں کھائی'' بندر لالا نے سب کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ اب پورے جنگل میں شور مچ گیا کہ بھالو میاں کی چاکلیٹ کس نے کھائی ہے۔ فیصلے کے لیے جنگل کے بزرگ کو بلایا گیا۔ زرافہ اور بچھو اور کچھوا جو جنگل کے بزرگ تھے ان سب نے فیصلہ سنایا کہ رات کو بھالو میاں کے گھر میں پہرہ داری کی جائے اور معلوم کیا جائے کہ یہ کام کس کا ہے۔ بندر لالا تو پریشان ہو گئے کہ اگر وہ چور رات کو نہیں آیا تو سب انہیں غلط سمجھیں گے۔

''تم پریشان مت ہو بندر لالا اللہ پر بھروسہ رکھو بلی، ہاتھی اور مورنی نے بندر لالا کو تسلی دی اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔''

☆

بھالو میاں کے گھر طوطا، تتلی اور گلہری کو پہرے داری کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ سب بھالو میاں کے گھر پہنچ گئے بھالو میاں اپنی چاکلیٹ ہاتھ میں تھامے سونے کے لیے لیٹ گئے اور سب ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

کچھ دیر گزری تھی جب گلہری کو کچھ آواز آئی گلہری نے جب بھالو میاں کی جانب دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس نے طوطے اور تتلی کو بلایا جب سب نے دیکھا تو پتا چلا بھالو میاں نیند میں ہی اپنی چاکلیٹ کھا رہے تھے۔ تتلی نے بھالو میاں کو اٹھایا اور بتایا کہ ان کی چاکلیٹ چوری نہیں ہوئی تھی بلکہ انہوں نے خود ہی کھائی تھی۔

بھالو میاں کو بہت شرمندگی ہوئی کہ انہوں نے بندر لالا پر غلط الزام لگایا۔ مجھے

''معاف کردو بندر لالا۔'' بھالو میاں نے سب کے سامنے معافی مانگی۔

''کوئی بات نہیں بھالو میاں مگر اپنی چیزیں سب کے ساتھ بانٹ کر کھانی چاہیے اس سے پیار بڑھتا ہے اور برکت بھی ہوتی ہے۔'' بندر لالا نے محبت سے کہا۔

''شکریہ بندر لالا اب میں اپنی چاکلیٹ سب ساتھ بانٹ کر کھایا کروں گا۔'' بھالو میاں نے خوش ہو کر کہا۔ ☆

کناز اور بلّی

راحیلہ شاہ

رات کا وقت اور خاصی سردی تھی۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوا نے ٹھنڈ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ کناز اور زینب گل کمرے میں بیٹھے اپنا ہوم ورک کر رہے تھے جبکہ ان کی امی کچن میں کام کر رہی تھیں۔

''میاؤں..... میاؤں'' اچانک ایک بلّی بند دروازے کے پاس پہنچ کر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے لمبی لمبی صدائیں دینے لگی۔ کچھ دیر تک وہ بند دروازے کو دیکھتی رہی، لیکن جب کوئی امید نظر نہیں آئی تو ایک بار پھر میاؤں میاؤں کر کے فریاد کرنے لگی۔

زینب گل نے خوف زدہ نظروں سے پہلے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر کناز کو۔ وہ بلّی کی آواز سے بے نیاز ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ زینب گل جھرجھری لے کر ہوم ورک کرنے کی کوشش کرنے لگی، لیکن دھیان دروازے کی طرف ہی تھا۔

''میاؤں، میاؤں''

بلّی مسلسل زور زور سے بول رہی تھی۔

''کناز! بلّی کو دودھ دے دو، لگتا ہے بھوکی ہے۔''

امی نے کچن سے آواز دے کر کناز سے کہا۔

''امّی جان! میں ہوم ورک کر رہا ہوں نا۔'' کناز نے بھی مصروف انداز میں جواب دیا۔

جواب سن کر ان کی ماں نے تاسف سے سر ہلایا اور خود جلدی سے بلّی کی کٹوری اٹھا کر اس میں دودھ ڈالا اور دروازے کے باہر رکھ دیا۔ بلّی نے دودھ کی کٹوری کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ اور زور و شور سے میاؤں میاؤں کرنے لگی۔

''یہ بلّی کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟'' کناز نے پنسل منہ میں رکھ کر پرسوچ انداز میں خود سے سوال کیا۔ زینب نے اس کی بات سن کر کہا:

''جا کر پوچھ لو نا!''

یہ کہہ کر خود ہی کھی کھی کرنے لگی حالانکہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ کناز نے گھور کر بہن کو دیکھا اور بولا:

''گل! تم پاگل ہو، وہ بلّی ہے انسان نہیں جو میں جا کر پوچھ لوں۔ خود تو دور سے دیکھ کر بھی ڈرتی ہو، ڈرپوک کہیں کی!'' کناز نے جواب دیا اور کتابیں سائیڈ پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کناز! اب تم کدھر جا رہے ہو؟'' زینب گل نے خوف سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''بلّی کو دیکھنے جا رہا ہوں کہ کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ'' کناز نے جواباً کہا۔

''کناز! مت جانا کیا پتا وہ کوئی بھوت ہو۔'' زینب گل نے اسے ڈرانا چاہا۔ امّی زینب گل کی بات سن کر مسکرا دیں۔

''تو ہوتا رہے، مجھے نہیں لگتا ڈر۔'' کناز نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا، تو زینب گل چند لمحے خاموش رہی لیکن پھر دوبارہ بول اٹھی:

''کناز! تم ڈاکٹر تھوڑی ہو جو بلّی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا تو تم حل کر لو گے۔'' زینب گل نے اپنی طرف سے کافی دانشمندانہ بات کہی۔ کناز چڑ گیا۔

''زینب گل! تم اپنے چھوٹے سے دماغ کو کیوں تکلیف دے رہی ہو؟ جو ہوگا میں دیکھ لوں گا۔ کون سا تمہیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔'' اس نے کوفت سے کہا اور باہر نکل گیا۔ زینب گل نے منہ بنا لیا۔

باہر نکل کر کناز نے دیکھا کہ بلّی بہت بے قرار ہے۔ وہ کناز کو دیکھ کر اور زور زور سے میاؤں میاؤں کرنے لگی اور کناز کے آگے پیچھے پھرنے لگی۔ اس نے دودھ کی طرف دیکھا جو جوں کا توں پڑا تھا۔ وہ حیران ہوا۔ بلّی اس کے آگے چلنے لگی تو کناز بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ دل میں ڈر بھی لگ رہا تھا، لیکن دل کڑا کر بلّی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ بلّی گھر کے داخلی دروازے کے پاس پہنچ کر رکی اور دروازے کے نیچے ایک چھوٹے سوراخ سے باہر نکل گئی۔ کناز بھی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دروازے کے پاس ہی ایک جگہ بلّی رکی اور پھر سے میاؤں میاؤں کر کے کچھ بتانے لگی۔ جوں ہی کناز کی نظر وہاں پڑی تو وہ حیرت سے دنگ رہ گیا۔

''امّی جان! کناز کہاں رہ گیا؟ بہت دیر کر دی اس نے۔'' زینب گل نے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آ جائے گا تم فکر مت کرو، جلدی جلدی ہوم ورک مکمل کرو پھر سونا بھی ہے۔'' امی نے بستر ٹھیک کرتے ہوئے جواب دیا تو زینب گل نے اثبات میں سر ہلا کر کلر بک کھول لی لیکن دماغ کناز میں اٹکا ہوا تھا کہ جانے وہ کدھر رہ گیا۔

''کاش مجھے اتنا ڈر نہ لگتا تو پیچھے چلی جاتی۔'' زینب نے دل ہی دل میں اداس ہو کر سوچا۔

گھر کے ساتھ ہی ایک نالی تھی جہاں بلّی کا معصوم بچہ گرا ہوا تھا اور اس میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن نکل نہیں پا رہا تھا۔ سردی بہت تھی۔ کناز گرم کپڑوں اور ٹوپی کے

باوجود سردی سے کانپ رہا تھا جبکہ بلّی کا بچہ پورا بھیگ چکا تھا۔ کناز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سر سے ٹوپی اتار کر ہاتھ پر رکھی اور بلّی کے بچے کو باہر نکال دیا۔ بلّی یہ دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ کناز بلّی کے بچے کو اٹھا کر گھر لے آیا اور ایک کپڑا لے کر اس میں بلّی کے بچے کو اچھی طرح ڈھانپ دیا، پھر اسے سٹور میں لے آیا۔ بلّی بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ کناز دودھ کی کٹوری اٹھا لایا اور بلّی کے سامنے رکھ دی۔ بلّی نے کافی لمبی میاؤں کر کے کناز کا جیسے شکریہ ادا کیا۔ کناز خوشی خوشی منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آ گیا۔ جب امّی اور زینب گل کو سارا واقعہ بتایا تو دونوں بہت خوش ہوئیں۔ ماں نے آگے بڑھ کر کناز کو گلے سے لگایا اور کہا:

''تمہیں اس اچھے کام پر بہت پیاری کہانیوں والی کتاب انعام میں ملے گی۔''

کناز یہ سن کر بہت خوش ہوا اور خوشی خوشی اپنا ہوم ورک مکمل کرنے لگا۔☆

جمبو کا سرپرائز

تماضر ساجد

جمبو بندر اچھلتا کودتا، ہنستا گاتا جنگل کی سڑک پر چلا جا رہا تھا:

نام ہے میرا جمبو بندر
رہتا ہوں میں شاخوں کے اندر
شوق سے کیلے کھاتا ہوں میں
روز اسکول میں جاتا ہوں میں

جمبو بندر، جمبو بندر!

اصل بات تو یہ تھی کہ جمبو کبھی شوق سے اسکول گیا ہی نہیں تھا۔ اسکول کی پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔

جمبو ''جوبن جنگل'' کا ایک شرارتی بندر تھا۔ جوبن جنگل ایک قصبے جوبن نگر کے کنارے آباد تھا۔ جنگل کے اکثر جانور قصبے میں جاتے رہتے تھے۔ قصبے والے انھیں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دیتے۔ جمبو تو ہر دوسرے دن قصبے میں پہنچا ہوتا۔ ہر گھر میں جھانک کر دیکھتا۔ اسے انسان بہت پسند تھے۔

ایک دن جمبو ایک گھر کی منڈیر پر بیٹھا کیلے کھا رہا تھا۔ اس گھر میں شہر سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے بچے نے اسے دیکھا تو حیرت سے چلا اٹھا:

''اتنا بڑا بندر! یہ تو جمبو سائز ہے!''

جمبو کو لفظ جمبو اتنا پسند آیا کہ اس نے اپنا نام جمبو رکھ لیا۔ اس کے دوستوں کو بھی یہ منفرد نام اچھا لگا تھا تب ہی اسے سب نے جمبو پکارنا شروع کر دیا اور اب وہ اسی نام سے مشہور تھا۔ جمبو اچھلتا کودتا کچھ دور ہی گیا تھا کہ سامنے سے دھاری دار زیبرا آتا دکھائی دیا۔ جمبو کو دیکھ کر وہ رک گیا اور پوچھنے لگا:

''جمبو بھائی بڑے خوش لگ رہے ہو؟''

''ہاں! خوش تو میں بہت ہوں۔'' جمبو مکاری سے مسکرایا۔

''ایسی کون سی بات ہے، مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''ارے! تمہیں ہی تو بتاؤں گا۔ ایک سرپرائز ہے لیکن مفت میں تو پتہ نہیں چلے گا۔'' زیبرا سوچ میں پڑ گیا۔

''اچھا چلو میرے پاس کچھ گنے پڑے ہیں جو میں نے ہاتھی کو تحفہ دینے کے لیے رکھے تھے، وہ تم لے لو۔''

جمبو بھاگ کر گیا اور گنے لے لیے۔ شام کو بتانے کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ گنگنا رہا تھا:

''نام ہے میرا جمبو بندر..... آہا''

ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ بی بطخ اپنے گھر کے باہر کھڑی دکھائی دی۔

''جمبو میاں بڑے خوش لگ رہے ہو؟''

''بات ہی کچھ ایسی ہے!'' جمبو مکاری سے بولا۔

''کیسی بات؟'' بطخ چونک اٹھی۔

''آج جنگل میں ایک مزے دار شو ہونے والا ہے۔ اس میں ایک سرپرائز پیش کیا جائے گا وہاں دیکھ لینا۔''

یہ سن کر بی بطخ نے جمبو کو پھندنے والی ٹوپی دے دی اور خود شو کا وقت ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ جمبو ٹوپی سر پہ جمائے گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ناک پر عینک جمائے بیٹھے اخبار پڑھتے خرگوش میاں نظر آئے۔ اس نے خرگوش کو بھی اپنی مصالحے دار باتوں میں الجھا لیا۔ آخر خرگوش نے اسے عینک دے دی مگر ساتھ ہی خبردار بھی کر دیا:

''جمبو! عینک لگانے سے نظر کمزور ہو جاتی ہے۔'' جمبو سنی ان سنی کرتا آگے بڑھ گیا۔

ایک جگہ بی لومڑی درخت کے نیچے کرسی بچھائے ہار بنانے میں مصروف تھی۔ جمبو نے ان کی منت سماجت کی تو انھوں نے ڈبے سے ایک پرانا ہار نکال کر جمبو کے حوالے کر دیا۔ جمبو نے اسے اپنے گلے میں ڈال لیا۔

اپنی چکنی چپڑی باتوں میں لگا کر جمبو نے اپنے دوست گھٹو بندر سے وہ جوتے بھی لے لیے جو وہ گاؤں کے ایک گھر سے اٹھا لایا تھا۔

اب جمبو جنگل کے آخری سرے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے زبان دانتوں تلے دبالی اور محتاط ہو کر دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ یہاں دو مسخرے کچھ سامان اٹھائے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ جنگل کے آخری سرے میں ایک سرکس سجانے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ وہ دونوں اپنا سامان حفاظت کی خاطر جنگل میں ہی لے آئے تھے۔ مگر جمبو کے ہوتے ہوئے حفاظت کیسی؟ ان کے جاتے ہی جمبو ان کے سامان کی تلاشی لینے لگا۔ اسے ایک رنگ برنگا

سوٹ ملا۔ جمبو نے تیزی سے کپڑے پہن لیے۔

اب جمبو کا حلیہ کچھ یوں تھا کہ وہ رنگ برنگے کپڑے اور جوتے پہنے، ناک پر عینک لگائے، گلے میں ہار ڈالے اچھلتا کودتا، گاتا واپس جنگل میں جا رہا تھا۔

''جمبو بندر ہوں...... آہا!''

شام ہو چکی تھی۔ سب جانور شام کی چائے پینے اور باتیں کرنے جنگل کے ہال میں جمع تھے جب کچھو نے سب کو ہوشیار رہنے کا کہا۔ جمبو اسٹیج پر حاضر ہوا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر سب نے زور و شور سے تالیاں بجائیں اور ''پروفیسر جمبو'' کے نعرے لگائے۔ جمبو سٹیج پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

''جمبو سرپرائز!'' سب جانوروں نے نعرے لگاتے ہوئے کہا۔

''اوہ بے وقوفو! یہ حلیہ سرپرائز ہی تو ہے۔'' لیکن جمبو کا سرپرائز دیکھ کر سب جانور غصے میں آ گئے۔ وہ چلانے لگے:

کہاں ہے سرپرائز؟ اور پھر سب نے اس پر انڈوں کی بارش کر دی۔ جمبو برا پھنسا تھا۔ وہ سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگا۔

بھاگتا ہوا وہ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ راستے میں پڑے کیچڑ سے پھسل گیا۔ کیچڑ سے نکل کر بھاگا تو بی لومڑی سے جا ٹکرایا۔

''جمبو پہلے میں بھی دوسروں کو دھوکا دیتی تھی لیکن اب دیکھ لو، سب مجھ سے دور ہو گئے ہیں اس لیے اب میں چپ چاپ ہار بنایا کرتی ہوں۔'' انھوں نے جمبو سے اپنا ہار واپس لیتے ہوئے کہا۔ بی لومڑی کا ہار واحد چیز تھی جو ابھی تک صحیح سلامت تھی ورنہ کپڑوں سے لے کر ٹوپی اور عینک تک سب چیزیں کیچڑ میں لت پت ہو چکی تھیں۔ بی لومڑی کی نصیحت پر غور کرتا جمبو ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا کہ مسخرے اس کے پیچھے لگ گئے۔ جمبو نے کپڑے اتار کر نیچے پھینکے تو ان سے جان چھوٹی۔

ابھی جمبو سکون کا سانس بھی نہیں لے پایا تھا کہ اس کے کان میں سرسراہٹ ہوئی۔ جمبو نے گھبرا کر سر اٹھایا تو اس کے ابو اس کا کان پکڑے کھڑے تھے۔

''جمبو تم نے میری ناک کٹوا کر رکھ دی ہے۔'' انھوں نے غصے سے کہا۔

''سدھر جا جمبو!'' مار کھانے کے بعد ابو کی تنبیہ سن کر جمبو دل ہی دل میں آئندہ ایسی شرارتوں سے باز رہنے کا عزم کرنے لگا۔☆

آزادی

صائمہ زکریا

فراز کو چڑیاں بہت پسند تھیں۔ جب بھی ان کو آزاد فضا میں اڑتا دیکھتا تو اس کا دل چاہتا وہ ان کو پکڑ لے اور اپنے پاس کہیں قید کر لے۔

اکثر وہ چڑیاں پکڑ بھی لیتا اور ان کو پنجرے میں قید کر دیتا اور سارا دن ان سے کھیلتا رہتا۔ فراز کی امی اسے بہت منع کرتیں کہ بیٹا ان چڑیوں کو آزاد کر دو ایسے کسی کو قید نہیں کرتے یہ بہت بری بات ہے۔ وہ ایسے سمجھاتیں کہ ان کے بھی بچے ہوں گے جو ان کے انتظار میں ہوں گے۔ لیکن فراز تو اُن کی ایک بھی نہ سنتا تھا بس اپنی من مانی کرتا تھا۔

ایک دن وہ سکول گیا، اور باتھ روم میں لاک ہو گیا۔ باتھ روم میں لاک ہونے کی وجہ سے بہت ڈر گیا اور بہت زیادہ رونے لگا۔ کچھ دیر بعد کسی ٹیچر نے اس کی آواز سن لی اور آ کر اسے باہر نکالا ٹیچر نے اسے بہت پیار کیا اور اسے تسلی دی اور گھر بھیج دیا۔

وہ گھر جاتے ہوئے راستے میں سوچ رہا تھا وہ تو بس کچھ دیر کے لئے قید ہوا تھا۔ وہ تو معصوم چڑیوں کو قید کر کے نہیں چھوڑتا، ان پر کیا گزرتی ہوگی؟ وہ کتنا چیخیں، چلاتی اور التجا کرتی ہیں۔ پھر بھی وہ ان کو آزاد نہیں کرتا۔ اسے اب احساس ہو گیا تھا کہ وہ کتنا غلط کرتا تھا اسے بہت شرمندگی ہوئی اور اس نے اللہ سے بہت رو، رو کے معافی مانگی۔ اور خود سے وعدہ کیا کہ اب وہ کبھی بھی چڑیوں کو نہیں پکڑے گا۔

اس نے سب چڑیوں کو گھر پہنچ کے آزاد کر دیا کیوں کہ اسے آزادی کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

بقیہ: شام سے پہلے

کھڑے مسافروں کو گھورتا ہوا گیٹ نمبر دو کی طرف بڑھنے لگا۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر وہ ''ایئر سائیڈ'' کی طرف بڑھا جہاں جہاز کھڑا تھا۔

ثانیہ اپنی امّی کی انگلی پکڑے دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی طرف جا رہی تھی۔ اپنے ''انکل'' کا ''تحفہ'' اس نے مضبوطی سے دوسرے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

''حمید الحق! کیا ابھی تمھارے لیے ہدایت کا وقت نہیں آیا؟'' دفعتاً حمید کا باپ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''بابا! میں بہت شرمندہ ہوں۔'' حمید کے لب ہلے۔

اگلے لمحے وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا تیزی سے ہوائی جہاز کی طرف دوڑنے لگا۔

''ثانیہ! رک جاؤؤؤؤؤؤ...... خدا کے لیے رک جاؤؤؤؤؤ۔''

ثانیہ اس کی آواز سن کر رک گئی اور اپنی امّی کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ ان کے قریب پہنچ کر حمید نے ثانیہ کے ہاتھ سے وہ نئی گڑیا چھین لی جس کے اندر بم موجود تھا۔ حمید گڑیا لیے دیوانہ وار ''آئسولیٹڈ بے'' کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ اسے اب کسی قیمت پر بھی اس جہاز اور اس کے مسافروں کی تباہی منظور نہ تھی۔

کیونکہ وہ شام سے پہلے گھر لوٹ آیا تھا اور جو شخص شام سے پہلے گھر لوٹ آئے اسے بھولا نہیں کہا جاتا۔

☆......☆......☆

قارئین کے کھٹے میٹھے اور دل چسپ خطوط والا منفرد سلسلہ!

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ!

السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سرورق بہت پیارا تھا۔ حمد اور نعت پسند آئیں۔ سپر ہیرو، کلورو ڈم ڈم، چُنی چڑیا، لاڈلے، شرارتی پردے، مٹی کا قرض، ساشا اور کوکو کہانیاں پسند آئیں۔ حنا نرجس کی ''انوکھی بھوک ہڑتال'' انوکھی کہانی تھی۔ ''چالاک سرمان'' پڑھ کر مزہ آیا۔

حافظ دانش عارفین کا مضمون بھی اچھا تھا۔ ''بارش'' اور ''وقت فجر'' نظمیں اچھی لگیں۔ ''ڈاکٹر بلو بلونگڑا'' عمدہ سلسلہ ہے۔

''الف نگر'' کے لیے بہت سی دعائیں۔

سلمان یوسف سمیجہ (علی پور)

☆ شکریہ

محترمہ مدیرہ الف نگر

السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا میگزین ہے تو بچوں کے لیے لیکن میں خود اسے بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آج مجھے جس کہانی نے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے۔ نور صبح یہ کہانی اپنے اندر ایک بہت بڑا معاشرتی پیغام لیے ہوئے ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں برداشت ختم ہو رہی ہے۔ ہم اپنے اردگرد سب کچھ من چاہا مانگتے ہیں اور اس کے لیے ہم کسی کی بھی دل آزاری کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے بچے بھی اسی روش پر چل نکلے ہیں اور ہم اپنے عظیم پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو یکسر فراموش کئے ہوئے ہیں۔ جو کہ ہمیں صبر اور برداشت کا درس دیتی ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار غلام رسول بہت خوبصورتی سے تراشا گیا ہے کردار کہانی کے مقصد کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ دوسری کہانی سارہ قیوم کی کلورو ڈم ڈم بھی بہترین کہانی رہی۔ کہانی میں ڈریگن، منا اور زینب تینوں ہی بہت اچھے لگے۔ خاص طور پر کہانی کے انجام پر جب زینب سمجھ جاتی ہے کہ طوطا بننے سے بہتر ہے کہ عقل مند اور مضبوط بنا جائے ڈریگن کی طرح تو کہانی کا مقصد پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

باقی بُھولا، سرمکھی چوس، ذرا سا پانی اچھی کہانیاں تھیں ''وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو'' نے دل جیت لیا۔ نظمیں سب اچھی تھی۔ اُلٹے میاں تو سب بچوں کو بہت پسند ہے۔ آخر میں ایک تجویز ہے کہ کوئی سلسلے وار کہانی شروع کی جائے۔ ''الف نگر'' کی پوری ٹیم کو اتنا اچھا شمارہ نکالنے پر مبارکباد

والسلام

عائشہ عثمان

☆ تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔

مدیرہ الف نگر!

آداب!

ستمبر، اکتوبر کا شمارہ مارکیٹ میں دیکھا تو بے اختیار لے لیا۔ شمارہ خرید کر مایوسی نہیں ہوئی۔ حمد، نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت اچھی لگی۔ دادا جان کی بیٹھک بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ فضہ شکیل کی کہانی جھولا ایک پُرسوچ کہانی تھی۔ اور بہت اچھا سبق دے رہی تھی۔ عائشہ اطہر کی نور صبح تو مجھے بہت سے گھروں کی کہانی لگی۔ خطبہ حجۃ الوداع کو بہت ہی اچھے طریقے سے واضح کیا گیا تھا کہانی میں۔ سپر ہیرو بھی بہت اچھی لگی۔ اقرا اعجاز کی کہانی ہمارے ایک بہت بڑے مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور ذرا سے پانی کی اہمیت سب کو بتاتی ہے۔ اساتذہ کے عالمی دن پر خاص کہانی سرمکھی چوس بہت پسند آئی۔ سونے چاندی کا محل، مٹی کا قرض ساشا اور کوکو، شرارتی پردے، چالاک سرمان سب بہترین کہانیاں تھی۔ آپی! میں نویں جماعت کی طالبہ ہوں۔ کیا میں بھی کہانیاں لکھ کر بھیج سکتی ہوں؟ پلیز ضرور بتانا۔

اللہ حافظ۔

فاطمہ خان (کراچی)

☆ فاطمہ! آپ ضرور کہانی لکھ کر بھیجیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ اتنے عمدہ تبصرے کے لیے شکریہ۔

بیادِ اقبال

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی نظمیں عمیرہ احمد کی نثر میں

6 Books in Rs 1500

To Order

0321 8460220

Free Delivery

الف کتاب پبلی کیشنز کی بچوں کے لیے خوبصورت رنگین کتابیں!

آرڈر کے لیے رابطہ کریں! 0321 8460220